بھاگتے لمحے

(افسانے)

عبداللہ جاوید

بھاگتے لمحے

نام کتاب	:	بھاگتے لمحے
نام مصنف	:	عبداللہ جاوید

مصنف کا پتہ:

7180, Lantern Fly Hollow, Mississauga
Ontarion, **Canada,** L5W 1L6
shahnazkhanumabidi@hotmail.com

تعداد	:	پانچ سو
اشاعت اول	:	دوہزاردس 2010ء
کمپوزنگ	:	مطیع الرحمٰن عزیز
طابع	:	گنج شکر پریس، لاہور
ناشر	:	سید وقار معین (0321-840 8750)
قیمت	:	—
تقسیم کار	:	ارشد خالد عکاس انٹرنیشنل پبلی کیشنز۔اسلام آباد

AKKAS PUBLICATIONS
House No 1164 Street No 2 Block C
National Police Foundation ,Sector O-9
Lohi Bhair, Islamabad, Pakistan
Tel.0300-5114739 0333-5515412

E- Mail:
akkasurdu2@gmail.com
akkasurdu@hotmail.com

انتساب

شہناز خانم عابدی

اور

سُہیل جاوید

کے نام

دل کی گہرائیوں سے

—— عبداللہ جاوید
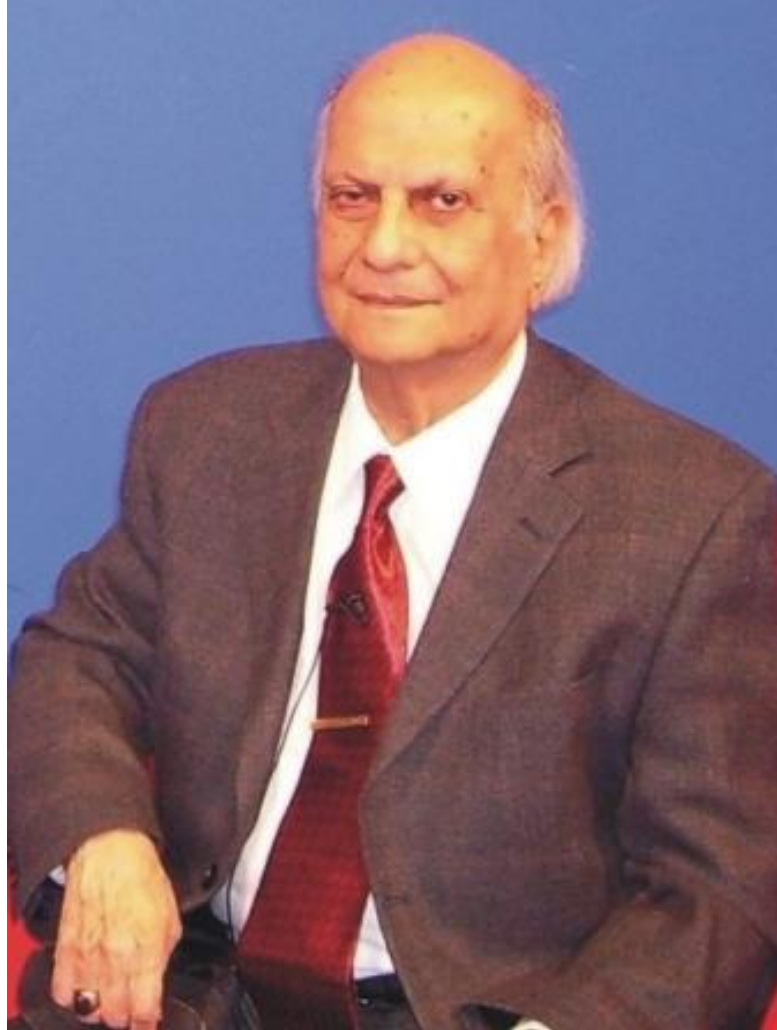
افسانوں کی ترتیب

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1	دخترِ آب	13
2	ہونے کا درخت	26
3	دسواں مکان	37
4	میری بیوی	40
5	عورت اور بچہ	49
6	چور	58
7	آگہی کا سفر	68
8	ایفل ٹاور	73
9	فلاور بگے	79
10	سانپ سایا اور خواب	84
11	برزخی	88
12	گاربیج	91
13	پرورش	95
14	انا	100
15	مشورت	103
16	آپ	105
17	اللہ میاں	111
18	کفارہ	114
19	جہان دیگر کے راستے پر	117
20	چھت سے گرنے والی	122

بھاگتے لمحوں کے پیروں سے لپٹ کر میں نے
اک گدایانہ صدا دی کہ ذرا ٹھہرو تو
روک لو اپنے قدم
ٹھہرو، خدارا ٹھہرو!
سوچنے دو مجھے اک لحظہ۔ ذرا سوچنے دو
بھاگتے لمحوں نے
ٹھکرا کے مجھے چھوڑ دیا
بھاگتے لمحوں نے
مڑ کر بھی نہ دیکھا مجھ کو

——— عبداللہ جاوید

مجھے بھی کچھ کہنا ہے

عبداللہ جاوید کے افسانوں کا یہ پہلا انتخاب پیشِ خدمت ہے اس میں چھوٹے بڑے بیس افسانے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اس میں ان کے ان افسانوں میں سے ایک بھی افسانہ شامل نہیں کر سکی۔ جو جاوید یوسف زئی کے قلمی نام سے چالیس کی دہائی کے اواخر سے ساٹھ کی دہائی کے وسط تک ہندستان و پاکستان کے مختلف جرائد میں شائع ہوئے تھے۔ادبی دنیا (لاہور) نظام ویکلی (ممبئ) میزان، رباب (حیدرآباد دکن) وغیرہ میں۔

ان افسانوں کے انتخاب میں ''تنوع'' کو ترجیح دی ہے۔ ان افسانوں کا محور زندگی ہے۔ ان میں عصری زندگی کے اہم موضوعات جنگ، سیاست، دہشت اور مادیت کے علاوہ تصوف اور ماورائیت کی جانب فکری اور حسی پیش رفت بھی ملے گی۔ کاش آپ کو میرا یہ انتخاب پسند آئے۔ میرا یہ انتخاب جیسا بھی ہے اچھا یا برا لیکن آپ کی نظر اور آپ کے قیمتی وقت میں سے کچھ حصہ کا امیدوار ہے۔

میں نے جاویدؔ صاحب سے ان کے افسانوں کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کی تو ہر مرتبہ صرف یہی کہا:

یاں وہی ہے جو اعتبار کیا۔

—— شہناز خانم عابدی

☆☆☆

کوائف

نام : محمد عبداللہ خاں جاوید

قلمی نام : ۱) جاوید یوسف زئی
۲) عبداللہ جاوید

تاریخ و مقام پیدائش : ۱۶ر دسمبر ۱۹۳۱، غازی آباد، یوپی، انڈیا

تعلیم : ایم اے (انگریزی و امریکی ادب)، ایم اے (اردو ادب)،
ڈی ایچ ایم ایس ، ایل ایل۔ بی

پیشہ : وکالت
انگریزی ادب کے لکچرار، پھر پروفیسر (قبل از وقت ریٹائر۔
منٹ لی۔

ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۲۔۱۹۴۳ء حیدرآباد دکن، ممبئی

شعبہ ہائے ادب : شاعری (اردو، انگریزی، افسانہ نگاری (اردو۔ انگریزی)
تنقید، مضامین، کالم

تصانیف : بیادِ اقبال (مضامین)
بچوں کے لئے کہانیوں کی دو کتابیں
: موج صدرنگ (شاعری) ۱۹۶۹ء

: حصارِ امکاں (شاعری) ۲۰۰۳ء
خواب سماں (شاعری) ۲۰۰۶ء
موج صد رنگ (طبع دوم) ۲۰۰۶ء
(افسانے) ۲۰۱۰ء

زیر ترتیب : تنقیدی و ادبی مضامین (انتخاب)
: خاکے (انتخاب)
: کالم (انتخاب)
: شاعری (انتخاب)
: افسانے (انتخاب)

متعلقات : کتاب: شاعر صد رنگ عبداللہ جاوید۔ تجزیاتی مطالعہ ۲۰۰۸ء۔
تصنیف : تسلیم الٰہی زلفی

☆☆☆

کہانی کار کی کہانی

بچہ	کہانیاں	سنتا ہے
جوان	——	سناتا ہے
		کہتا ہے
		لکھتا ہے
بوڑھا	——	اپنے پیچھے چھوڑ کر
		خود بھاگتے لمحوں کے ساتھ
		ایک کہانی بن جاتا ہے

☆☆☆

واقعہ اور کہانی

واقعے کی عمر چھوٹی ہوتی ہے
واقعہ معمولات میں شامل
ہو جاتا ہے۔
واقعے میں کہانی نہیں ہوتی
واقعے میں کہانی کی آمیزش
سے واقعہ مر جاتا ہے

کہانی کی عمر بڑی ہوتی ہے
کہانی غیر معمولی رہتی ہے
کہانی میں واقعہ ہوتا ہے
کہانی میں واقعے کی آمیزش
سے کہانی زندہ ہوتی ہے

لیکن

تخلیق کائنات واقعہ بھی ہے اور کہانی بھی۔

☆☆☆

......دُخترِ آب......

بیوی سے بک بک جھک جھک کر کے وہ سمندر کی طرف چلا گیا۔

غنیمت تھا کہ موسم سمندر مخالف مزاج کا نہ تھا۔ موافق اور مناسب تھا۔ ورنہ وہ تو ایسے ایسے موسم میں سمندر کے کنارے پہنچا ہے جب کوئی صحیح الدماغ آدمی سمندر کا رخ نہیں کرتا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ سمندر کا رخ ہی اس وقت کرتا تھا جب اس کا دماغ صحیح نہیں ہوتا یا پھر دل۔ شدید غصہ، دکھ، صدمہ، اداسی، مایوسی، ذہنی کرب دل کی بے چینی یا کوئی گہری نامعلوم کیفیت اس کو سمندر کی جانب دوڑا دیتی۔ ہر طرف برف ہے۔ زمین پر ٹھنڈی سفید برف کا فرش بچھا ہے۔ سمندر کا پانی دور دور تک جمی ہوئی برف میں بدل چکا ہے لیکن حضرت اور کچھ نہیں تو گاڑی دوڑا کر ساحل سمندر کے قریب ترین رسائی کے لائق مقام پر پہنچے ہوئے ہیں۔ خواہ تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی۔ سمندر سے اس کا بہت پرانا رشتہ تھا۔ یہ کیسا رشتہ تھا؟ کوئی نہیں جانتا تھا یہ رشتہ کب سے تھا۔ پہلے پہل کب استوار ہوا تھا۔ کوئی اور تو کیا وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ سب کچھ ایسے ہی تھا، شاید اس کے بچپن سے یا شاید بچپن سے بھی پہلے۔ اس کی پیدائش سے بھی پہلے سے۔ اس وقت سے جب وہ پیدا تو نہیں ہوا تھا لیکن تھا اور سمندر بھی پیدا نہیں ہوا تھا، لیکن کسی نہ کسی شکل میں کہیں نہ کہیں موجود تھا۔ اس دن جب وہ سمندر کے کنارے اپنے مخصوص چٹانی پتھر پر بیٹھا سمندر کو اپنے اندر لینے کے لئے اپنے آپ کو کھلا اور ڈھیلا چھوڑا تو اس کو ایک خلافِ معمول صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا۔ معمول کے مطابق تو یہ ہوتا تھا کہ سمندر کا جادو اس کے وجود پر چھا جاتا اور وہ اپنا سب کچھ فراموش کر دیتا۔ یوں لگتا کہ سمندر کی کوئی طاقتور موج اس کا سب غم و غصہ، دکھ درد، نہ چاہے جانے کا، نہ سمجھے جانے کا، تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس کے علاوہ صریح غلط بخشی کا سارا کرب خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گئی اور فوراً بعد کوئی اور موج مثبت عناصر کی ایک تازہ کمک سے اس کے ذہن دل کو معمور کر گئی۔ ایسا تو ہونا ہی تھا اور ہوتا ہی کیونکہ سمندر نے اسے آج تک مایوس نہیں کیا تھا لیکن اس شام وہی کچھ کسی اور انداز میں ہوا۔ نہ تو کوئی موج اس کے منفی عناصر بہا کر کے لے گئی اور نہ ہی اس کے بعد دوسری موج مثبت عناصر سے معمور کر گئی۔ برسوں کا یہ معمول اس شام نہیں ہوا۔ اس کی جگہ ایک نیا اور خلافِ توقع واقعہ پیش آیا اس کی آنکھوں نے ساحل کے بہت ہی قریب، بصارت اور بصیرت کی حد کے اندر، ایک بے حد خوبصورت اور روشن وجود کو متحرک دیکھا۔ اس طرح حرکت کرتے ہوئے وجود کو دیکھ کر یہی گمان گزرے گا کہ مچھلی سطح آب پر آ گئی ہے لیکن روشنی اور وہ بھی عجیب و غریب روشنی جیسے آگ، شعلہ، برق، چاندنی اور دھوپ کو باہم دیگر آمیز کر دیا گیا ہو اور اس کو قوس وقزح کا ست رنگی جامہ پہنا دیا گیا ہو۔ سطح آب کے بالکل قریب وہ سنہرا، روپہلا، بلکہ رنگ برنگا وجود اپنے حسن تابناک کی جلوہ سامانیاں بکھیر رہا تھا۔ اس نے سمندر کے کنارے بچپن سے لے کر اب تک کیا کچھ نہیں دیکھا بھانت بھانت کے پنکھ پکھیرو، جانور، چرند، درندے، تانبیل، کچھوے، کیکڑے اور

مچھلیاں، بھانت بھانت کی مرغابیاں، بطخیں، قاز، بگلے اور نجانے کیا کیا۔ وہ سمندر کے کنارے ان مقامات تک جاتا جہاں کوئی نہ ہوتا ورنہ آباد اور بارونق ساحلوں پر تو مچھلیاں بھی نہیں آتیں سوائے سی گلوں کے جو لوگوں کا جھوٹا کھاتی ہیں۔ جس وجود کو وہ اپنے پورے ہوش وحواس میں ہوش وحواس کھو دینے کے انداز میں دیکھ رہا تھا وہ قطعی طور پر ان دیکھا، انجانا، ان سوچا اور ان کہا تھا۔ اس نے سفر ناموں اور سیاحوں کے روزنامچے بھی بہت پڑھے تھے لیکن گپ باز سے گپ باز اور جہاں گرد سیاح نے ایسے کسی وجود کا ذکر نہیں کیا تھا۔ الف لیلوی کہانیوں، ایکس زون، ٹوائی لائٹ زون کے زیرِ عنوان چھپنے والے نام نہاد سچے قصوں میں یہاں تک کہ دوسری دنیاؤں اور سیاروں کی کہانیوں میں بھی اس جیسے کسی وجود کا ذکر اس کے پڑھنے میں نہیں آیا تھا۔ وہ ابھی پانی کے اوپر نہیں آیا تھا شاید پانی میں متوازی اور افقی انداز میں تیر رہا تھا سچ تو یہ ہے کہ اس کے تیرنے کا انداز بھی تیرنے جیسا نہ تھا۔ پانی سے اٹکھیلیاں کرنے کو تیرنا نہیں کہا جا سکتا۔ وہ بہت دیر تک اس کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ جس طرح اچانک نظروں کے سامنے آیا تھا، اسی طرح نظروں سے غائب ہو گیا۔ بعد میں وہ بے حس وحرکت بیٹھا اس مقام کو نجانے کتنی دیر تک تکتا رہا۔ اس کو یاد نہیں۔ اس کے غائب ہونے کے بعد اس نے اپنے ہوش وحواس سمیٹے اور اس کے بارے میں سوچا۔ وہ کیا تھی؟۔ یہ بات تو قطعیت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ مؤنث تھی۔ اس کی چھٹی حس نے اس پر مُہر تصدیق ثبت کر دی تھی بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ چھٹی، ساتویں، آٹھویں، نویں بلکہ ہزارویں حس (اگر انسان کو اتنی ساری حسیں مہیا ہیں) نے بھی یہی کہا تھا کہ وہ جنسِ مخالف سے تعلق رکھتی ہے۔ تو گویا وہ لڑکی تھی۔ انسان تھی۔ وہ اگر لڑکی تھی انسان تھی تو کہاں غائب ہو گئی۔ آخر کنارے پر کیوں نہیں دکھائی دی۔ یہ تو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس کی گاڑی کنارے پر کھڑی ہوئی پیچ در پیچ چٹانوں اور جگہ جگہ اُگی ہوئی جھاڑیوں کی آڑ میں موجود ہو اور گاڑی میں اس کے ساتھی بھی ہوں لیکن یہ کیسے ممکن ہوا کہ وہ پانی کے اندر ہی اندر کسی طرف کنارے پر نکلی اور اس کی نظروں میں آئے بغیر غائب ہو گئی۔ سوچنے اور کہنے کی حد تک تو یہ درست ہے کہ وہ غائب ہو گئی لیکن کیا وہ حقیقت میں غائب ہو گئی تھی۔ غائب ہونے میں وہ ظاہر تھی، ظاہر ہونے میں وہ غائب تھی۔ اس کی غیر موجودگی ہی اس بات کا ثبوت دیتی ہے کہ وہ غیر موجود ہے تو کسی اور مقام پر موجود ہے۔ عین اس طرح جس طرح وہ خود اپنے مکان میں غیر موجود اور اس غیر آباد ساحل پر موجود ہے اور اب اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس ساحل کا ایک نام ہے اس سمندر کا ایک نام ہے جو دو ملکوں کے درمیان بہہ رہا ہے ان ملکوں کے بھی نام ہیں — جُدا جُدا جیسے اس کا اپنا ایک نام ہے اور اس لڑکی کا بھی — ''بہرحال ناموں کے تفرقوں سے قطع نظر کر کے میں اس لڑکی کو بھی اپنے وجود کے اندرونی گوشے میں لئے اپنی گاڑی کی طرف جا رہا ہوں''۔ اس نے واضح طور پر اپنے آپ کو یقین دلایا۔ لڑکی نے اس کے اندر اپنا تسلّط جما لیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے گاڑی کا رخ گھر کی جانب پھیرنے کے بجائے مخالف سمت میں ایک قریبی موٹیل کی جانب کر دیا۔ یوں بھی اس کی ذہنی حالت گھر جانے کے لائق نہیں تھی۔ وہاں اس کی بیوی تھی۔ اس کی بیوی — چڑیل۔ بچپن میں اس نے چڑیلوں کی بہت ساری کہانیاں پڑھی تھیں — بڑے ہونے پر پتہ چلا کہ ''چڑیلیں'' نہیں ہوتیں۔ پھر اسے یاد آیا کہ بچپن میں اس کا اسکول میں جیتی جاگتی ''چڑیل'' سے واسطہ پڑا تھا۔ بھلا سا نام تھا لیکن لڑکے لڑکیاں اس کی غیر موجودگی میں ''چڑیل'' کہہ کر ہی اس کا ذکر کرتے تھے۔ وہ اسکول کی وائس پرنسپل تھی۔ اسے ایک اور ٹیچر یاد آ گئی جو جادوگرنی (وچ) کہلاتی تھی۔ ایک دن باتوں باتوں میں اس نے اپنے والد سے ''چڑیل'' اور ''جادوگرنی'' کہہ کر پرنسپل اور

میتھس کی ٹیچر کا ذکر کر دیا۔ والد نے اس کے کولھوں پر ایک زور کا ہتڑ رسید کیا۔ ''اسکول کے اساتذہ کا احترام کیا جاتا ہے''

''you have to be polite with your teachers even in their absence''

''تمہیں اپنے اساتذہ کا ادب کرنا چاہئے۔ ان کی غیر موجودگی میں بھی''

اس نے اپنے رونے پر قابو پاتے ہوئے ''سوری'' کہا تھا۔ عین اسی وقت اس کی ماں آموجود ہوئی تھی اور پھر ماں اور باپ آپس میں اس معاملے پر لڑ پڑے تھے اور وہ ''بیس مینٹ'' (Basemnet) میں جا کر پنجرے میں بند پیلی چونچ اور بڑے سے تاج والے طوطے سے باتیں کرنے لگا تھا جس کو ایک روز قبل اس کی خالہ دے گئی تھیں۔ اس کی ماں اس بات کے خلاف تھی کہ باپ بچوں کو مارے۔ بچوں پر ہر طرح کی سختی کا حق دار وہ صرف اپنے کو سمجھتی تھی اور اس میں کسی کی شرکت اسے گوارہ نہ تھی۔ اسے یہ یاد کر کے ہنسی آ گئی کہ اس کی ماں کی ماں یعنی نانی کو یہ گوارا نہ تھا کہ اس کی بیٹی بچوں کو مارے پیٹے ظاہر ہے بڑوں کے ان اختلافات کا فائدہ بچوں کو پہنچ رہا تھا۔ بچے تین تھے وہ اور اس کی دو بڑی بہنیں اس چھوٹ کی وجہ سے بچے تینوں کے تینوں خودسر اور ضدی ہو گئے تھے اور سب سے بڑھ کر وہ خود ہر طرح ایک اسپوائلٹ چائلڈ (SPOILT CHILD) بگڑا بچہ تھا۔ یوں بھی اس کی دو بڑی بہنوں کے ساتھ نے اس کے اندر نسوانیت پیدا کر دی تھی وہ موقعہ بے موقعہ آئینہ دیکھنے لگتا تھا۔ اس کے حق میں ایک بات اچھی ہوگئی کہ وہ اور اس کی بہنیں جُدا جُدا اسکولوں میں داخل ہوگئی تھیں۔ ماں نے باپ کے مرضی کی پرواہ کئے بغیر لڑکیوں کو ایک کیتھولک گرلز اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ اس طرح وہ اسکول کی حد تک اپنی بہنوں کے زیر اثر رہنے سے بچ رہا ورنہ نسوانیت اس پر حاوی ہو جاتی اور وہ ایک ایسا لڑکا بن جاتا جس کو دوسرے لڑکے ''سسی'' کہنے لگتے ہیں تاہم وہ لڑکوں کے مردانہ کھیلوں میں پھسڈی ہی رہا۔ نہ تو بیس بال میں اس کا دل لگا اور نہ کسی اور کھیل میں۔ جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا اس کا ذوق واضح ہوتا گیا وہ ایک پیدائشی آرٹسٹ نکلا۔ بنیادی رنگوں سے شناسائی تو اسے عمر کے چوتھے سال ہی میں ہوگئی تھی۔ رنگوں سے کھیلنے کے ساتھ وہ لکیروں سے بھی کھیلتا۔ لکیریں جو نقطوں سے جنم لیتی ہیں دو نقطوں کو ملانے سے بنتی ہیں اور نقطوں کو ملانے سے ہی شکلیں بنتی ہیں۔ ہندسی (جیومیٹریکل) شکلیں، مثلث، مربع، مسدس وغیرہ۔ ان ہی سے مستطیل بھی بنتے ہیں اور مخروط بھی اور پھر جب نقطہ پھیلتا ہے تو دائرہ جنم لیتا ہے۔ ہر نقطہ دائرہ نہیں بنتا البتہ ہر دائرے کا ایک نقطہ ضرور ہوتا ہے۔ دائرے کا تصور قوس کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ قوس کے ساتھ نیم قوس ـــــ اور پھر محور ـــــ اور محیط جب وہ آرٹ کی کلاس میں دوسرے لڑکے اور لڑکیوں کے ساتھ ماڈل کا اسکیچ بنا رہا تھا جو ایک جوان عورت تھی تو اس کے آرٹ ٹیچر نے تخلیق کا یہ نکتہ بیان کیا تھا کہ قدرت نے عورت کا جسم دائروں اور مخروطوں سے تشکیل دیا ہے۔ سب لڑکے اور لڑکیوں نے ماڈل کے برہنہ جسم کو اپنی نظروں سے چھلنی کر دیا تھا۔ مستقبل کے ان آرٹسٹوں پر کچھ گزر رایا نہیں گزر رااس سے نہ تو آرٹ ٹیچر کو کوئی واسطہ تھا اور نہ ہی ماڈل کو۔ ایک آرٹ کا دیوانہ تو دوسری ڈالر کی۔ ایک دن عبادت خانے میں خالق کائنات کے گیان پر بات کرنے کے دوران پادری، پنڈت، ملا جو کوئی بھی تھا کہنے لگا ''اس کے دھیان اور گیان کا راستہ ایک نقطے سے نکلتا ہے ـــــ جب تک آپ نقطے کا گیان نہیں کرتے دائرے تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہم سب اس غلطی کے مرتکب ہیں اس لئے دائرے کے چکر میں گرفتار ہیں۔ دائرے سے مرکز تک پہنچتے پہنچتے صدیاں درکار ہیں سو لوگو پہلے مرکز پر دھیان دو۔ پہلے خالق کو مانو۔ پھر کائنات کی طرف جو اس کی تخلیق ہے۔ خالق مرکزی نقطہ ہے اور

کائنات اس نقطے سے تشکیل پانے والا دائرہ ہے''۔اس کی کار موٹیل پہنچ گئی۔گاڑی چلانا درحقیقت شعوری کام اس وقت تک رہتا ہے جب تک آپ اناڑی ڈرائیور ہیں۔بعد میں تو سب کچھ نیم شعوری ریفلیکس (Reflexes) پر چلتا ہے۔اس دوران اس نے منیجر سے ٹیلی فونی رابطہ کرکے اپنے آپ کو رجسٹرڈ بھی کرالیا تھا۔ایک مرتبہ سب کچھ سیٹل (Settle) کر لینے کے بعد وہ سیدھا ہال میں چلا گیا۔ ہلکا پھلکا کھانا آرڈر کرکے اس نے ڈرنک کی چُسکیاں لیں اور جب گرمی اس کے حلق سے اتر کر معدے کا رخ کرنے کی جگہ سر میں چڑھی تو اس کو یہ پتہ چلا کہ اس نے تو اتر کے ساتھ چار پیگ چڑھا لئے تھے،اور ساتھ ہی اس کو یہ بھی پتہ چلا کہ وہ اس سے پیشتر آرٹ ٹیچر اور کسی پیشوا کے رٹے رٹائے فقروں کے بیچوں بیچ موجود تھا۔دونوں جانب ہندسی اشکال تھے نقطے تھے دائرے تھے اور نجانے کیا الّم غلّم۔اس کو اچانک یاد آیا کہ پیرس میں پینٹنگس کی تازہ ترین نمائش میں اس کے پانچ شاہکار رکھے گئے ہیں۔اب کی مرتبہ اس کو یقین تھا کہ ایلیگر و Allegro نامی اس کمپیٹیشن میں وہ ضرور اول انعام لے گا۔یوں تو اس کو چھوٹے بڑے بے شمار اعزازات اور انعامات،دنیا کے قریب ہر مقابلۂ آرٹ میں مِل چکے تھے لیکن کسی بڑے مقابلے میں اول آنے میں وہ ہمیشہ ناکام رہا تھا۔اس ناکامی پر وہ ہمیشہ ایک طنزیہ مسکراہٹ سے کام چلا لیا کرتا۔

''بیچارے وہ کیا جانیں میرے رنگ کس زبان میں باتیں کرتے ہیں اور میرے برش کے توانا اور پُراعتماد اسٹروکس اس کی جانب کیسے واضح اشارے کرتے ہیں۔جو موجود ہو کر بھی غیر موجود ہے۔لیکن ان کی سمجھ میں آنے لگے گا وہ جان جائیں گے ــــ ان کو جاننا پڑے گا۔ان کو میری عظمت کا اعتراف کرنا پڑے گا۔میں سب سے منفرد ہوں جس میں جسموں کے باطنی وجودوں کو مصور کرنے والا ہوں۔میرے رنگ مقدس راگ الاپتے اور میرے اسٹروکس ان پر دیوانہ وار رقص کرتے ہیں۔اس رقص اور موسیقی کی فضا میں میری تخلیقات تجرید اور تجسیم کے آواگون سے دوچار رہتی ہیں۔میں فنا اور بقا،ہستی و نیستی کا فنکار ہوں''۔ہر بڑی ناکامی کے بعد وہ کچھ اس طرح سوچتا اور مسکرا پڑتا۔وہسکی کے چار پیگ اس کی حد تھے بعد میں پیتے رہنے کا مطلب وہ جانتا تھا ــــ چنانچہ اس نے آرڈر کئے ہوئے کھانے کی جانب رجوع ہونے میں ہی اپنی عافیت جانی۔کھانے کے دوران اس نے ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لیا۔

کوئی چہرہ،کوئی شخصیت ایسی نہ تھی جس پر دوسری نظر ڈالی جاسکتی۔دور کے کونے میں ایک چھوٹی میز کے ساتھ بیٹھی ہوئی ایک بوڑھی عورت کے ماسوا جس کی عمر ستر سے تجاوز کر چکی تھی لیکن ہنوز اس کے جسم کا رُواں رُواں زندہ تھا اور چہرے کے خط و خال ہلکے سروں میں گنگنا رہے تھے۔وہ شاید خاموشی سے اپنے ساتھی کی باتیں سن رہی تھی۔دونوں سیاح لگتے تھے۔اس کا مرد ساتھی اس سے قدرے بڑی عمر کا تھا لیکن اس نے اپنی داڑھی مونچھیں رنگی ہوئی تھیں اور سر پر بڑی ساری ٹوپی منڈھ رکھی تھی۔ایسی ٹوپی جس کو اتار کر بیٹھنا یا سلام کرتے وقت اتارنا لوازمۂ تہذیب نہیں ہوتا ــــ کسی کو گھورنا چونکہ خلافِ تہذیب ہے وہ اس جوڑے کو وقفے وقفے سے دیکھ رہا تھا۔درمیانی وقفوں میں ہال میں مصروفِ رقص جوڑوں پر نظر ڈال تا رہا تھا۔موٹیل کا ہال رسمی سا تھا اس میں رقص کرنے کا رواج بھی نہ ہونے کے برابر تھا اور موسیقی کا انتظام بھی صرف کام چلانے کی حد تک۔غیر معمولی لیکن ''ٹین ایجرس''میں مقبول گیتوں کی دھنیں بجتی رہتی تھیں۔ویسے گاہکوں کی مہیا کی ہوئی سی ڈیز' ڈی وی ڈیز اور کیسٹیں بھی بجالئے جاتے تھے۔لیکن بادلِ نخواستہ۔جب اس کی نگاہ ایک بار پھر گھوم کر دور کنارے میز کی جانب گئی تو اس کے سامنے ایک جھما کا سا ہوا وہاں ایک مہمان کا اضافہ ہو چکا تھا اور وہ لڑکی کم اور آبی رنگوں سے بنائی ایک تصویر زیادہ دکھائی دیتی تھی۔

اس نے آبی رنگوں میں بہت کم کام کیا تھا لیکن جو بھی کیا شاہکار کام تھا۔اس کے آبی رنگ کبھی دریا کی موجوں کی طرح بہتے تو کبھی کسی معصوم کنواری کی آنکھوں سے پھول رخساروں پر ڈھلک آنے والے آنسوؤں کی طرح پھسلتے اور کبھی یوں ڈبڈباتے جیسے نیم واکلیوں میں صبح کی شبنم—— آبی رنگوں میں برش کے اسٹروکس کی حتی الامکان کفایت اس کی انفرادیت تھی نتیجہ ظاہر تھا کہ اس کے آبی رنگوں کے شاہکاروں میں جسموں کے اندر سے روحیں باہر آجاتیں۔اتنے فاصلے کے باوجود اس لڑکی کی روح اس کے جسم سے باہر آکر اس کی آنکھوں کی راہ سے اس کے وجود کی گہرائیوں میں اترتی معلوم ہوئی اور ساتھ ہی اس کے شعور کی رَو نے ایک بار پھر اس کی نگاہوں کے سامنے سمندر کے کنارے تیرنے والے نسوانی پیکر کو موجود کر دیا۔اس کے اندر یہ خواہش شدت کے ساتھ ابھر آئی کہ وہ اس وجود کو پکڑ لے لیکن اس نے اپنی اس بچکانہ خواہش کو اپنے اندر سے باہر جھٹک دیا اور اپنے آپ سے بولا ''یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔کیا مجھے مزید پینا چاہئے''۔

اس کی نگاہیں آپ ہی آپ اس کونے کی جانب چلی گئیں۔''او مائی گوش! یہ لڑکی کتنی زیادہ آبی ہے جیسے پانی اور رنگ سے بنی ہو اور اس کا چہرہ کتنا ٹرانسپیرنٹ (شفاف) ہے۔بیرونی چہرے کے پیچھے سے اندرونی چہرہ جھلک جھلک پڑتا ہے۔کیا واقعی وہ اتنی ہی حسین ہے جتنی دکھائی دیتی ہے؟ حسنِ قاتل جیسے اس کے تصور میں کوئی زہرہ، کوئی قلوپطرہ، کوئی کارمن، کوئی ڈیلائیلہ یا کوئی ہیلن ابھر آئی ہے''۔اسے یقین تھا دنیا کی ساری حسیناؤں کی تخلیق آبی رنگوں سے ہوئی ہوگی۔اور ہر قابل ذکر حسینہ ٹرانسپیرنٹ ہی لگتی ہے۔وہ تو اپنی کرسی پر جمار ہا لیکن اس کا اندرونی وجود' اسے حیران چھوڑ کر' اس دور کونے میں رکھی ہوئی چھوٹی سی گول میز کے اطراف بیٹھے ہوئے لوگوں تک پہنچ گیا۔وہ اب ان چاروں افراد کا تفصیل سے جائزہ لے رہا تھا۔ان کو محسوس کر رہا تھا شاید ان کی باتیں بھی سن رہا تھا۔جبکہ اس کا ظاہری وجود اس گوشے کی جانب گھورنا بھی ترک کر چکا تھا۔کسی کو گھورنا خلاف تہذیب جو ٹھہرا۔اس کے چھٹے، ساتویں، آٹھویں، نویں سنس نے ان کی باتیں اندر ہی اندر اسکو سنوا دیں۔خوبصورت بزرگ خاتون اس حسینہ (شفاف) سے کہہ رہی تھیں۔

''او مائی سویٹ تم ہمیں کہاں لے آئیں۔یہاں خاک تفریح ہے۔توبہ توبہ پانی کی شور مچاتی موجوں کے علاوہ کچھ بھی تو نہیں''

''خاک تفریح تو نہیں ہے البتہ آب تفریح ضرور ہے۔مائی ڈیئر ڈیئر گرینی''

لڑکی نے بات کو ہنسی میں ٹال دیا:

''یہ مُوا سمندر تیری ماں کی بھی کمزوری تھا''

''کمزوری نہیں گرینی۔سمندر تو میری موم کی طاقت تھا۔میری موم سمندر پر حکمرانی کرتی تھی۔وہ ملکہ تھی۔سمندر کی ملکہ۔وہ سمندر کی موجوں میں تیرتی نہیں تھی بلکہ فاتحانہ خرام کرتی تھی'' شفاف چہرے والی لڑکی کا چہرہ اپنی ماں کی پیراکی کا ذکر کرتے ہوئے مزید شفاف ہو گیا تھا شاید اسی ذکر نے اس کو اپنی سیٹ پر واپس پہنچا دیا جہاں وہ ایک بار پھر اپنے اصل وجود میں ضم ہو کر اس حسینہ کے تصور میں کھو گیا۔جس کو اس نے پانی کی لہروں سے طلوع اور پھر ان ہی لہروں میں غروب ہوتے دیکھا تھا۔

''وہ سمندر کی موجوں پر خرام کر رہی تھی اس شفاف حسینہ کی ماں کی مانند یا پھر——یا پھر ان پر محو رقص تھی——؟'' اس نے اندر ہی اندر اپنے آپ سے سوال کیا اور جواب میں اس کے اندر نے الٹا پوچھا ''تم یہ کیوں نہیں سوچ سکتے کہ وہ پیراک حسینہ یہ بھی تو ہو سکتی ہے۔یہ شفاف

حسینہ؟ اس کی ماں موجوں پر چلتی تھی تو کیا یہ سمندر کی موجوں پر رقص نہیں کر سکتی ــــ؟'' اس کے ذہن میں ایک وقفۂ سوالات سا گزر گیا اور جوابات کے مرحلے پر اس نے اپنے آپ کو یقین دلایا۔

''نہیں ــ۔ یہ قیاس درست نہیں ہے۔ یہ لڑکی وہ نہیں ہو سکتی ــــ وہ لڑکی یہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے اندر کوئی مستقل ترغیب دے رہا تھا کہ کرسی چھوڑ کر ان لوگوں کے پاس جائے۔ وہ اٹھا اور تیز تیز قدموں سے چل کر اپنے روم میں پہنچا اور ٹی۔ وی آن کر کے اپنے آپ سے راہِ فرار اختیار کر لی۔ اسکرین پر کسی انشورنس کمپنی کا اشتہار تھا۔ ''زندگی آپ کی طرف بہت تیز آتی ہے'' جب کبھی وہ یہ اشتہار دیکھتا تو بڑبڑاتا ''زندگی آپ کے پاس سے بہت تیز جاتی ہے۔''

کچھ دیر ٹی وی۔ دیکھنے کے بعد اس نے اس کو سوئچ آف کیا۔ کمرے کی تیز بتی بھی بجھائی اور بستر پر دراز ہو گیا۔ آنکھیں بند کیں تو اس کی بیوی سامنے آ گئی۔ تصوّر میں بھی وہ ایک چڑیل ایک کڑک مرغی ہی نظر آئی۔ جس سے فرار کر کے تصور ہی تصور میں وہ ساحلِ سمندر پر پہنچ گیا۔

''اے سمندر تو میرا ہمدم، میرا اہم راز ہے'' کسی شاعر کا یہ مصرع اس کے ذہن میں گونجنے لگا اور وہ سمندر کی لہروں میں یا نیند کی باہوں میں پڑ کر سو گیا۔

صبح اس کا سر بھاری تھا۔ سر میں اور کندھوں میں درد ہو رہا تھا اتنی کم پینے کے باوجود ' ہینگ اوور'' وہ بڑبڑایا بستر سے ایک چھلانگ لگائی اور دن کی مصروفیات میں الجھ گیا ــــ جب وہ گھر پہنچا تو یہ سوچ کر کہ وہ بیوی کو خاطر میں نہ لائے گا۔ اپنے اسٹوڈیو کی طرف بڑھا۔ لیکن اس کا گھر تو بھائیں بھائیں کر رہا تھا اسکی تنگ مزاج لڑاکا بیوی گھر چھوڑ کر جا چکی تھی۔ گھر کی ساری قیمتی اشیاء غائب تھیں اس نے گھر کا صفایا کر دیا تھا ــــ جب وہ بیڈ روم میں پہنچا تو اس کا چھوڑا ہوا پرچہ ملا۔ لکھا تھا۔

''میرے پیچھے نہ آنا'' اس نے درست لکھا تھا اس کے پیچھے جانا فضول تھا اور نہ ہی اس سامان، نقدی، زیور کے لئے کچھ کیا جا سکتا تھا جو وہ لے گئی تھی۔ چیک بُک بھی جگہ پر نہیں ملی ــــ جس کا مطلب صاف تھا کہ بینک کا بھی صفایا ہو چکا ہوگا۔ اس نے بینک فون کیا معلوم ہوا کہ تھوڑی سی رقم اس کی بیوی نے شاید اس پر ترس کھا کر چھوڑ دی تھی۔ اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور 'شِٹ' کہہ کر دیوار کو ٹھوکر ماردی۔ اس سے پہلے کہ وہ گھر میں کچھ توڑ پھوڑ مچاتا، اس کا بدن آپ ہی آپ ایک صوفے پر گر اپڑا۔ وہ قریب قریب بے سدھ پڑا تھا۔ سامنے لگی کلاک کی سوئیاں چکر لگانے میں مصروف تھیں 'ٹک ٹک، ٹک ٹک' وقت گزر رہا تھا، گزرے جا رہا تھا۔

وقت کو اس نے ہمیشہ اپنا دشمن سمجھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وقت انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اس کی بیوی جو اس کو اس طرح چھوڑ کر بھاگ چکی تھی، اسی دشمن کا حوالہ دے کر لڑا کرتی تھی۔

'تم مجھے وقت نہیں دیتے ہو'

'بیوی؟ ہونھ کتیا؟ (بچ)!

فکنگ بچ! اس کو ہر وقت ــــ موقع بے موقع ــــ وقت چاہیئے تھا۔ اس کی فالتو باتیں سنُو ــــ سُنے جاؤ ــــ اس کے بے ہودہ، ذوق سے

عاری محض فیشن کے مطابق لباس کی تعریف کئے جاؤ۔ اس کے لیپا پوتی کئے ہوئے جی متلانے والے چہرے کو دیکھے جاؤ۔ تعریفی نظروں سے ــــ اس کے باہر نکلے ہوئے بھدے بٹکس کو ہاتھوں سے تھپتھپاتے جاؤ۔ جیسے سائنس گھوڑی کو تھاپی دیتا ہے۔ ــــ شاید وہ گھوڑی ہی تھی کتنیا کم گھوڑی زیادہ، اس کے قریب جاؤ تو اس کے بدن کے مختلف حصے پھڑ کنے لگتے تھے۔ جیسے کسی گھوڑی کا بدن اپنے سائیس کو یا مالک کو یا پھر کسی گھوڑے کو قریب پا کر پھڑ کتا ہے۔ 'ڈیٹس اَٹ' وہ شاید گھوڑی ہی تھی پیچھے جاؤ تو دولتیاں جھاڑنے والی آگے جاؤ تو بڑا سا منھ پھاڑ کر کندھے کو جکڑنے والی۔ 'اُس پہنچاننے میں خود سے غلطی سرزد ہوئی' اس نے سوچا اور پھر سوچ کا سلسلہ چل نکلا۔ 'وہ سب میرا ہی قصور تھا، میں نے اپنے گھر کے دروازے ایک گھوڑی کے لئے کھول دئے تھے۔ وہ ہنہناتی ہوئی اندر آ گئی۔'' اسے پہلے بیڈروم، پھر لونگ روم پر قبضہ جمالیا۔ بیڈ روم میں وہ اس پر دولتیاں جھاڑتی اور لونگ روم میں اپنی جیسی گھوڑیوں اور ان سے جفتی کھانے والے گھوڑوں کا مجمع لگائے رکھتی۔ فیملی روم کچن، اور اسٹڈی کو اس پر چھوڑ رکھا تھا۔ کھانا پکانے سے اُسے بیر تھا ار جو کبھی شوق فرماتی تو سارا کا سارا گاربیج کرنا پڑتا۔ وہ تو کہو اللہ تعالیٰ کے کرم سے دو بہت ہی سلیقہ مند ملازم ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ایک مرد اور ایک عورت۔ وہ دونوں بٹلر، باورچی، خانساماں، کیئر ٹیکر سب کچھ تھے۔ اس کی بیوی۔ سوری ــــ گھوڑی کو تو کوفی بنانی بھی نہیں آتی تھی، جب ملازم ادھر ادھر ہوتے تو وہ کافی بنانے کی فرمائش کرتی۔

'ذرا کافی بنادو ڈارلنگ تمہیں پتہ ہے نا مجھے پر کولیٹر سے وحشت ہوتی ہے۔'!

وہ مٹک کر بولتی۔ اسے پر کولیٹر ہی سے نہیں گھر کے ہر کام سے وحشت ہوتی تھی۔ اس کو ویکیوم کلینز استعمال کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ اگر ملازم گھر پر نہ ہوں اور کوئی ضرورت آن پڑے تو وہ پیار سے آواز دیتی 'ذرا اِلونگ روم میں ویکیوم کردو ڈارلنگ' اور اُسے اپنی اسٹوڈیو کی مصروفیت ترک کر کے اور رنگوں میں اَٹے ہوئے لباس میں لونگ روم کی صفائی کرنا پڑتی۔ اگر وہ آنا کانی کرتا تو صفائی کرنے کے لئے ایک ایسی اسپینی میڈ کو کال کرتی جس کی منحوس صورت دیکھنا اسے قطعی منظور نہ تھا۔

نجانے وہ اپنی گھوڑی بیوی کے بارے میں کتنی دیر تک اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا۔ اچھی طرح یاد نہیں کہ ایسے موقعوں پر وہ دل ہی دل میں سوچتا یا پھر بڑ بڑاتا ہے۔ وہ اپنی بیوی پر ہنسنا چاہتا تھا۔ زور زور سے ہنسنا چاہتا تھا۔

''اچھا ہی ہوا وہ چلی گئی'' وہ اٹھا آئینے کے سامنے کے کھڑے ہو کر ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے اور اپنے عکس کو آئینے کے اندر ہنستا دیکھتے دیکھتے وہ تھک گیا۔ اس کے جبڑے دُکھنے لگے۔ عکس کے اندر جو تھا، ہ باہر نہ تھا۔ پتہ نہیں کیوں اسے ایسا لگا کہ آئینہ اس سے جھوٹ بول رہا تھا۔ پُرانے زمانے میں آئینے سچ بولتے تھے، لیکن پرانے زمانے میں آدمی ڈالروں کے پیچھے اتنا دیوانہ نہ تھا'' وہ بڑ بڑایا اور کسی دماغی رَو کے تحت ٹیلیفون کے بٹن دبا دئے۔ دوسری جانب رئیل اسٹیٹ کا آدمی تھا۔ ''ہائے۔ دنیا کیسی جارہی ہے اولڈ مین؟''

''جیسی جاتی ہے ــــ ینگ مین؟''

''اس کا مطلب ہے تم مجھے پہچان گئے ہو؟''

''تم خوب جانتے ہو میں تمہاری آواز پہچان لیتا ہو۔ آرٹسٹ شیطان ــــ بولو کیسے کال کی؟''

بھاگتے لمحے

رئیل اسٹیٹ کا ایجنٹ اپنے کام میں پیشہ ورانہ لیکن اپنے سلوک میں خوش مزاج آدمی تھا۔اس نے پہلے ہی اپنے اس عظیم الشان وِلا کو برائے فروخت کے طور پر لگوا رکھا تھا۔ بڑے عرصے کے بعد اس کا ایک جینوئن خریدار بھی سامنے آیا ہوا تھا۔اب جو اس کی بیوی نے یہ انتہائی قدم اٹھالیا تو یہ ضروری ہوگیا تھا کہ اپنے مکان کے دام ہاتھ کرلے۔مبادا اس کی بیوی سب پیسے اڑانے کے بعد کسی گھوڑے وکیل کے ساتھ ہنہناتے ہوئے آئے اور نصف مکان کی دعویدار بن کر دولتیاں جھاڑنے لگے۔اس خیال سے اپنے اسٹیٹ ایجنٹ کو مناسب داموں پر ڈیل فائنل کرانے کے انسٹرکشن دے دئے۔اس طرف سے جواب ملا۔

''نو پرابلم — ڈیل ہوگئی، سمجھ لو — کب تک مُو و کرنے کا ہے؟''

''ڈیل کے ساتھ ہی فوراً — مجھے کوئی نوٹس پیریڈ درکار نہ ہوگا۔کسی دیانت دار مووِنگ ایجنسی سے بھی تم ہی معاملات طے کروا دینا۔''

''او کے یو آر دی باس'' اسٹیٹ ایجنٹ نے جواب دیا۔

ٹیلیفون بند کر کے وہ اسٹوڈیو میں داخل ہوا اور اپنی ادھوری اور اہم پینٹنگس کو احتیاط سے پیک کرنے میں لگ گیا۔اسٹوڈیو کی پیکنگ کو وہ ''موورس'' (Movers) کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

ایک ہفتہ کے اندر اندر وہ اپنے شاندار ولا نُما مکان سے دست بردار ہو چکا تھا۔''ایک مرتبہ وہ پھر بے گھر ہوگیا۔زندگی میں کئی بار وہ گھر سے بے گھر ہُوا۔اسے اچھی طرح یاد نہیں۔ یہ عصر جدید ہے، پرانے زمانے میں لوگوں کے آبائی گاؤں، آبائی شہر، آبائی رہائش گاہیں — محل، فورٹس، کوٹھیاں، بنگلے اور مکان ہوا کرتے تھے اور تو اور قبرستان بھی آبائی ہوتے تھے۔ بڑے لوگ جہاں کہیں بھی مرتے لیکن دفن ہوتے تھے اپنے خاندانی قبرستان میں''۔

اس نے سوچا اور سوچتے میں مسکرا دیا۔

بہر حال وہ اپنے آپ کو 'ہلکا' محسوس کر رہا تھا۔اب اس کے لئے اڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔اس کے ایجنٹ نے اس کے ضروری سامان کو ایک ماہ کے لئے بحفاظت رکھوا بھی دیا تھا۔ وہاں سے سب کچھ اس ایجنسی کے لوگ اس کے اگلے پتے پر بھجوا دینے والے تھے۔ ''اگلا پتہ'' ابھی اس کا کوئی اگلا پتہ نہ تھا۔

وہ اپنی پسندیدہ ایئرویز کے ایک جَمبو کی گود میں پیرس کے لئے اڑ رہا تھا اور دوران پرواز ہمیشہ کی طرح زمین سے منقطع ہونے کو اس طرح محسوس کر رہا تھا جس طرح کوئی بچہ کسی تیز رفتار جھولے میں پہلا جھونکا لیتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔اس کا بچپن اس سے کبھی جدا نہیں ہوا تھا۔

''کیا سب آدمیوں کے بچپن بھی اسی طرح چپکے ہوئے رہتے ہیں؟'' اس نے سوال کیا ساتھ ہی اس کے ذہن میں ایک اور سوال اُبھرا۔

''یہ میں کس سے سوال کرتا ہوں؟'' کیا میرے اندر میرے سوا کوئی اور بھی ہے؟

کیا ہر آدمی کے اندر کوئی دوسرا آدمی بھی ہوتا ہے؟۔کیا ہم سب دوہری شخصیتوں کے مالک ہوتے ہیں؟' کیا آدمی اسپلٹ ہونے کے امکان میں زندگی گزار دیتا ہے جب کہ کوئی کوئی اس سے دوچار بھی ہو جاتے ہیں۔

''ڈیول پرسنالیٹی'' ہونھ ''ہم بگ'' یہ ماہران نفسیات۔!

سائیکاٹرسٹ ـــ لٹیرے ـــ احمق آدمیوں کی جیبوں کو ہلکا کرنے والے جیب تراش آج ڈیول پرسنالیٹی کا مسئلہ اٹھتا ہے تو بہت جلد ملٹی پل پرسنالیٹی کا شوشہ اٹھ جائے گا۔

''ملٹی پل'' کا دور جو ٹھہرا'' عین اُس وقت فضائی میزبان نے کچھ پینے کے لئے پیش کیا۔''کوئی سی بھی اسکاچ'' اس نے لڑکی کے یونیفارم کے اندر سے چھلکتے ہوئے بدن کو ایک آرٹسٹ کی نگاہ سے جانچتے ہوئے کہا ـــ وہ مسکرئی۔ پیشے کی مسکراہٹ تقسیم کرنے میں وہ کیوں بخل سے کام لیتی۔''موسیو ـــ اپنی ایئرویز کی ایک خاص وائن کی سفارش کروں گی۔ ہماری اسپیشیلیٹی'' اس نے انتہائی شائستہ انداز میں اپنا رٹا یا فقرہ اس کی سماعت میں انڈیل دیا۔''اوکے۔اوکے ـــ تم جس طرح چاہو مجھے قتل کرو! میرے لئے تو تم خود ایکسٹرا اسپیشل ہو۔''

لڑکی نے جام پیش کیا اور اٹھلا کر چلی گئی۔

وہ اس لڑکی سے قطعاً غیر متاثر تھا اور جو کچھ اس نے بولا اور جو کچھ اس نے ظاہر کیا وہ صرف اور صرف رسمی خوش اخلاقی تھی ـــ فضائی میزبان ایسا ہی سلوک اپنے مہمانوں سے ایکسپیکٹ کرتی ہیں۔

ان کے ساتھ اگر ایسی شوٗلری نہ دکھائی جائے تو وہ غریب اپنے کوٗنا کام' سمجھنے لگیں۔شراب جو اس لڑکی نے پیش کی وہ حقیقت میں اچھی تھی،اس کے پہلے ہی گھونٹ نے اس کو سوالات کے اس جھمیلے سے باہر نکال دیا،جس میں وہ بُری طرح الجھ گیا تھا۔اب وہ اپنے اس وجود میں واپس آچکا تھا،جس کا تعلق حُسن،تخلیق حسن،رنگ،روشنی اور شیڈس سے تھا۔آرٹ ویونگ (حسن بینی) اور آرٹ کری ایٹنگ (تخلیق حسن) میں نمایاں فرق یہی ہے،تصویر دیکھنے والا رنگ دیکھتا ہے۔تصویر بنانے والا رنگوں کے ساتھ ان کی روشنی اور سایوں کو بھی پینٹ کرتا ہے۔اگر آپ مصور ہوں تو اس حقیقت سے بھی واقف ہوں گے کہ رنگوں کی تخلیق روشنی سے ہوتی ہے۔جب روشنی ٹوٹتی ہے تو بنیادی رنگ جنم لیتے ہیں۔باقی سارے رنگ ان رنگوں کی پرچھائیاں (شیڈس) ہوتے ہیں۔وہ روشنی اور اس کی پرچھائیوں کا بڑا پارکھ تھا۔رنگ اس کو دھوکہ نہیں دے سکتے تھے،وہ ان کی ایک ایک ادا،ایک ایک ناز،ایک ایک نخرے سے واقف تھا۔رنگ بھی اس کے ایک ایک برش کو پہچانتے اور ان کی نوکوں پر آتے ہی ان کے تابع فرمان ہونا جانتے جیسے وحشی سے وحشی رہوار کسی شہ سوار کی رانوں کی گرفت کو محسوس کرتے ہی اپنی گردن،کمر اور چاروں ٹانگیں اس کے قابو میں دے دیتا ہے۔فضائی میزبان کی دی ہوئی شراب کیف آور تھی،لیکن تیز نہ تھی۔فضائی کمپنیاں تیز شرابوں سے اپنے مسافروں کو دور رکھتی ہیں،لیکن بعض لوگوں کے لئے شراب کا نام ہی بہت ہے۔چنانچہ ایک بڑی عمر کے شریر بچے نے کسی فضائی میزبان کی ران میں چٹکی لے لی پہلے تو وہ ایک دو قدم آگے چلی پھر اُلٹے قدموں لوٹی اور اس 'بڑے بچے' کے پاس ادب سے جھکی اور بولی:

موسیو! میں سپروائزر سے آپ کی شکایت کر سکتی ہوں،لیکن ایسا کرنے سے اپنے آپ کو روک رہی ہوں۔ مجھے آپ کی عزت عزیز ہے۔توقع کرتی ہوں موسیو! آپ بھی میری عزت کا پاس کریں گے۔'' یہ کہہ کر وہ بڑے پروقار انداز سے چلتی ہوئی آگے بڑھ گئی ـــ چال کی اس تبدیلی کو محسوس کر کے وہ حیران رہ گیا گھوڑی ـــ اس نے سوچا یا شاید ہلکی آواز میں بڑبڑایا اور مسکراتے ہوئے سوچا عالم حیوانات میں گھوڑا ہی وہ جانور ہے جو نہایت غیر محسوس طریقے سے اپنی چال بدل لیتا ہے۔اس کی چار اقسام کی چالیں بھی مشہور ہیں۔ڈلکی ـــ ابھی وہ باقی تین

چالوں کے بارے میں سوچنے ہی والا تھا کہ بڑے بچے مسافر نے حقارت سے دانت پیس کر آواز لگائی۔ 'فلنگ بچ' اور پھر اس کی جانب دیکھ کر ایک آنکھ دبائی — اس نے بڑے بچے کے اس احتیاط کو قدر دانی سے محسوس کیا کہ یہ فقرہ اس نے فضائی میزبان کے عقب میں اس وقت پھینکا جب وہ شاید اس کی آواز کی پہنچ سے دور ہو چکی تھی۔ اس کا جی چاہا بڑے بچے سے بولے 'کتیا نہیں میرے بھائی — گھوڑی۔! شراب کے بعد کھانا اور سوفٹ ڈرنک — پھر کافی — پھر ٹی۔ وی اسکرین پر مووی اور سوچ — سوچ میں — بیوی — ماں — ماں باپ میں بظاہر مسلسل اختلاف رائے — تو تو — میں میں — چھوٹی جھڑپیں — بڑی جھڑپیں — جنگیں — مار پیٹ لیکن وہی ایک ساتھ رہائش بیڈ روم ہی نہیں بیڈ بھی ایک — جوانی — پختہ عمر — ریٹائرمنٹ بُڑھاپا — ملازمہ پر انحصار — اولڈ ہاؤس میں نہ کوئی بھیجنے پر راضی اور نہ کوئی جانے پر تیار پھر — باپ کی وفات اور اس کے پیچھے ماں بھی صرف چند ہفتوں کے اندر — عجیب — ناقابل فہم رفاقتِ عمری — مزاجوں میں — ذہنوں میں۔ پسند ناپسند میں ہم آہنگی، نہ ہونے کے برابر — ایک قطب شمالی تو دوسرا قطب جنوبی — جسموں میں قدرِ مشترک — صفر۔۔ والد ٹھگنے اور موٹے — والدہ۔ لمبی اور دبلی — والدہ خواب دیکھنے والی — والد انسانی روبوٹ — والدہ بنیاد پرست مذہبی۔ والد خدا کے وجود پر شک البتہ 'جیسس' پر یقین رکھتے تھے۔ اولاد میں وہ خود بھگوڑی بیوی کا شوہر — روشنی، رنگ اور پرچھائیوں کا قیدی، ہر وقت کی سوچ میں گرفتار، زمین سے آسمان تک سوچ کے سلسلے، شعور کی رویں — نیم شعور کی رویں اور لاشعور کا ماورائی خلا لیکن خدا — اس کی سوچ میں خدا نہیں آتا اور آتا بھی تو چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتا۔ جیسے کالی رات میں بجلی کا کوندنا۔

دو بہنیں جن کو ماں نے لڑکوں سے علیحدہ پالنے کی کوشش کی۔ لڑکیوں کے کیتھولک اسکول میں پڑھوایا لیکن گرمیوں کی چھٹیوں سے کوئی محفوظ رہ سکتا ہے؟ لڑکیوں کو وہ بیچ پر جانے سے کیسے روک سکتی تھی؟ بیچ پر ماں باپ کہیں۔ لڑکیاں کہیں اور وہ کہیں۔ ماں کی مذہبی طبیعت اور روز مرہ کی زندگی میں بنیاد پرستی کی وجہ سے ہم تینوں کی زندگی میں جنس (سیکس) قدرے تاخیر سے داخل ہوئی۔ بیچ پر دوسرے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ انتہائی نوعمری میں بھی وہ لڑکیاں تاکتا پھرتا۔ اس کے بعد جیسے جیسے بڑا ہوا چھوٹی بہن کی سہیلیوں نے اس کی اُستانیوں کا کام کیا — چھوٹی بہن اپنا بدن دیکھ لینے کا موقع بھی دے دیا کرتی تھی۔ بڑی بہن ان معاملوں میں بڑی سخت تھی۔ چھوٹی بہن کو یہ کہتے ہوئے سنا ''دیدی کیا تم ماں کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے'' موسٹربیشن سے کام چلاتی ہو۔

''ہاں'' جب تک شادی نہیں ہو جاتی''

''پلیز دیدی — کنڈوم کے استعمال کی سہولت ہے نا — میری سہیلیاں موسٹربیشن کے بہت خلاف ہیں''

''اپنی سہیلیوں کی کیا بات کرتی ہو جیسی تم ویسی تمہاری سہیلیاں''

''او مائی گوش! دیدی — یہ کیا کہہ رہی ہو — ہوش میں آؤ — ماں پرانی دنیا کی مخلوق ہے۔ اب اس کا زمانہ گزر گیا ہے۔''

''میں ماں کی طرف ہوں — شادی ہونے تک وہی کروں گی جو ماں نے کیا تھا — بس — ڈیٹس اِٹ'' اس نے سیکس کے بے شمار گُن بڑی جلدی اور بہ آسانی سیکھ لئے۔

کچھ سکھانے والیوں کی وسیع القلبی کے سبب سے تو کچھ اپنے تجسس کی تحریک پر — پُرونا گرافی سے اسے دلچسپی نہیں رہی لیکن عریاں

تصاویر کا دلدادہ ہونے میں دیر نہیں لگی۔ وڈیو کیسٹس، کتابیں، ڈی وی ڈیز، سی ڈیز، ٹی وی، موویز — انٹرنیٹ اس نے سیکس کے عہد میں پیدا ہونے کا حق ادا کیا، لیکن سیکس میں ڈوب نہ سکا۔ وہ تخلیق کار تھا، بہت جلد اس نے عریانی میں حُسن تلاش کرنا سیکھ لیا۔ عریانی اس کو سیکس کے عمل کی جانب راغب کرنے کی جگہ حسن تخلیق کرنے کی جانب مائل کرنے لگی۔ ''بہنوں کا کیا بنا — ؟''

یہ سوچ کر وہ ہنس پڑا۔ تقدیر کا مذاق — اس کی چھوٹی — شرارتی سیکس کے معاملات میں وسیع القلب لڑکی — آج ایک ''نن'' ہے اس نے شادی نہیں کی اور نہ ہی اس کا کوئی ایسا ارادہ ہے — بڑی بہن — بنیاد پرست مذہبی مجنوں ماں کی چہیتی بیٹی اور اس کی تعلیمات پر کامل وِشواس رکھنے والی — آج ایک کامیاب 'اسٹرپ ٹیز' پرفارمر ہے۔ اس کا میاں غیر عیسائی ہے۔ اسٹیج کا اداکار ہے، دونوں کی ایک شوخ وشنگ بیٹی ہے جس کو وہ مووی ایکٹریس بنانے کی فکر میں ہیں۔

ابھی وہ تقدیر اور معاملات جبر وقدر پر سوچتے ہوئے قدرت اور پھر خدا کی جانب سوچ کو لے کر جانے والا تھا کہ درمیان میں کھانے پینے کے ایک دو وقفوں کے بعد — نئی دنیا سے پرانی لیکن ہمیشہ چکا چوند مچانے والی دنیا یعنی فرانس پہنچ گیا۔ دنیا نے الٹی سیدھی کئی کروٹیں لیں، لیکن فرانس — فرانس رہا آرٹ اور کلچر کا ملک اور پھر جمہوریت کا ملک — مادر جمہوریت — انقلاب فرانس کا مُلک۔ ڈیگال ایئرپورٹ نے اس کو پیرس میں لا پٹخا اور پیرس جہاں ایفل ٹاور ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے، پیرس کا شہر ایک ہمیشہ یکساں رہنے والی خاتونِ آہن (Iron Lady) کے قدموں میں پھلتا پھولتا، چمکتا دمکتا رہتا ہے اور اس کی گھما گھمیوں کے عین وسط سے دریائے سین (Seine) مستانہ تموّج سے بہتا رہتا ہے۔

اس نے پیرس کو اور پیرس نے اسکو اچھی طرح دیکھ رکھا تھا۔ پیرس نے اس کے لئے اپنی باہیں کھول دیں اور وہ پیرس سے بغل گیر ہو گیا۔

پیرس کے ان تمام مقامات سے اس کا کوئی لینا دینا نہ تھا جنکی زیارت کرنا سیاحوں اور پیرس میں قدم رکھنے والوں کے مقدس فرائض میں داخل تھا۔ اب اس کے لئے یہ بھی دلچسپی کی چیز نہ رہا تھا کہ ہیڈرا لک لفٹوں کی مدد سے ایفل ٹاور کی چوٹی تک جا پہنچے اور وہاں سے قریب قریب سارے شہر کو اپنی آنکھوں میں اتار لے۔ خاصے فاصلے پر سا کرے کیر (Sacre coeur) ٹروکا ڈیر (TrocAder) بالکل سامنے دوسری جانب نوٹرے ڈیم (Notre Dame) اور دیہات جو مِل جُل کر شہر بناتے ہیں اور شہر کے بیچوں بیچ دریائے سین (Sein) — ایفل ٹاور کا سوچ کر وہ طنز سے مسکرایا۔ اس نے سوچا پسند — ناپسند — قدر — ناقدری کچھ بھی تو لائقِ اعتبار نہیں — دیرپا نہیں۔ اسی ایفل ٹاور کی تعمیر پر کتنی لے دے ہوئی تھی جب وہ 1889 میں کھڑا کیا گیا — آج پیرس کا سمبل ہے۔ سیاحوں کی دلچسپی کے مقامات میں چیمپ ڈی مارس (Champ de Mars) ہے بالکل نشیب میں عقبی جانب جو سترہ سو پینسٹھ عیسوی (1765) میں فوج کے نئے بھرتی شدہ جوانوں کا پریڈ گراؤنڈ ہوا کرتا تھا اور بعد میں بڑے بڑے انقلابی واقعات کا اور بین الاقوامی نمائشوں کا میدان بنا۔ اس سے کچھ فاصلے پر سنہری گنبد والا ہوٹل ڈی انویالڈس (HOTAL DES INVALIDES) لوئی چہاردہم (lovis xiv) کے زمانے میں فوجی اسپتال تھا اور آج فوجی میوزیم اور نپولین کے مقبرے پر مشتمل ہے۔ فوجی پریڈ گراؤنڈ، فوجی ہسپتالوں، فوجی میوزموں اور مشہور فوجی طالع آزما، فاتح عالم بننے کے خواب دیکھنے والے فرانسیسی ہیرو (جنرل) نپولین بونا پارٹ کے مقبرے سے بھی اسے سروکار نہ تھا البتہ اس

مقبرے کے چند قدم کے فاصلے پر اٹھارہویں صدی کا قصرِ عالی شان ہوٹل بائرون (HOTEL BIRON) اس کے لئے ایک اہم زیارت گاہ تھی۔ اپنے معمول کے مطابق اب کی مرتبہ بھی وہ دو تین چکر ضرور لگانے والا تھا۔ ہوٹل بائروں میں روڈین میوزیم کو وہ کس طرح نظر انداز کر سکتا تھا اور ہوٹل بائروں سے اسکی عقیدت کس طرح کم ہو سکتی تھی جہاں دنیا کے اس منفرد اور عظیم مجسمہ ساز روڈین نے اپنی زندگی کے آخری برس گزارے۔ وہ تو اس باغ میں دیوانہ وار گھومتا پھرتا تھا جس کی فضا میں لیموں کے پیڑوں کی مخصوص مہک اور گلابوں کی خوشبو رچی رہتی ہے۔

اس کے ذہن میں یہ معاملہ کبھی بھی واضح نہیں ہو سکا کہ روڈین کے مجسمے لیموں کی مہک میں رچے ہوئے باغ کی فضا اور گلابوں کی خوشبو اس کو علیحدہ علیحدہ متاثر کرتے ہیں یا باہم مِل جُل کر ـــ وہ یہ بھی سوچا کرتا کہ روڈین کے مجسموں کو دیکھنے والے اپنے حواس پر قابو کیسے رکھ لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر مجسمہ سازی سے معمولی بھی شغف نہ رکھنے کے باوجود وہ روڈین کے ایک ایک مجسمے میں دیر تک کیا تلاش کرتا ہے؟۔ مجسمے کے خالق روڈین کو یا روڈین کے خالق کو؟ ان احساسات کے بیچوں بیچ یہ احساس کیوں موجود رہتا ہے کہ ان مجسموں کے اندر شیطان اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ زندہ اور متحرک ہے۔ یہ کیوں لگتا ہے کہ ہر تخلیق کے عقب میں الہرمن یزداں کے ساتھ مہیش وشنو کے ساتھ گتھم گتھا ہے۔

پیرس میں چین کا سانس لیتے ہی اس کی آنکھوں کے آگے پانی موج زن ہو گیا۔ تخلیق کا آغاز زمین پر نہیں بلکہ پانی پر ہوا تھا یا یوں کہئے پانی میں ہوا تھا۔ پانی کی لہروں میں زندگی کی توانائیاں کتنی صاف اور واضح دکھائی دیتی ہیں اور پھر ان کا سکوت موت کے کتنا قریب۔ ان ہی لہروں میں ''وہ'' دکھائی دی تھی ـــ تیرتی ہوئی، ـــ بہتی ہوئی ـــ ان پر چلتی ہوئی، تھرکتی ہوئی ناچتی ہوئی، اور پھر ان میں گم ہوتی ہوئی۔ اس کو ایک ہفتہ پیرس میں قیام کرنا تھا ـــ اس امید موہوم پر کہ شاید اس کی کسی تصویر کو انعام کے لئے چن لیا جائے ـــ شاید ـــ مقابلے کا نتیجہ ٹھیک ساتویں دن تھا ـــ اس دوران وہ ایک مرتبہ بھی اپنی اور دوسرے فن کاروں کی وہ تصاویر دیکھنے نہیں گیا جو مقابلے کے لئے رکھی گئی تھیں۔ ان تمام مقامات سے بھی وہ گریز کرتا رہا جہاں سیاحوں کی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے۔ جوئے کے بدنام زمانہ کلبوں سے دور رہا اور ان اڈّوں سے بھی جہاں شوقین مزاج، لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے جاتے ہیں۔ اس کیفے سے بھی دور۔ جہاں سارتؔر اور کاموس جیسے دانشور کافی پیا کرتے تھے۔ ایسے تمام کیفوں، ریستورانوں پر تیسرے درجے کے فلمی ستاروں کا قبضہ رہتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عام قسم کے کیفوں میں کسی کونے کی میز پکڑتا اور بھانت بھانت کے کپڑوں میں ملبوس مردوں، عورتوں، لڑکوں لڑکیوں کو دیکھتا اور جلد ہی اکتا کر باہر آ جاتا۔ پیرس سے اگر آپ بور ہونا چاہیں تو بور بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ بھی بور ہور ہا تھا۔ بوریت کو دور کرنے کے لئے۔ گھٹیا پبوں (Pubs) کے کاؤنٹر پر گھٹیا شراب کے پیگ چڑھاتا۔ پیرس خوشبوؤں اور شرابوں کا شہر ہے لیکن اس کی جیب میں اعلیٰ شرابوں کے لئے پیسے نہیں تھے اور سچ پوچھئے تو اس کا مزاج بھی اعلیٰ شرابوں کے لائق نہ تھا۔ اس مزاجی کیفیت میں تو نفیس سے نفیس شراب پانی ہو جاتی ہے۔

پیرس یاترا کے پانچویں دن قبل از وقت وہ پانی کی جانب کھنچا چلا گیا اور موجوں کی مار کھانے میں شام کر دی۔ اس رات خواب میں 'وہ' آئی اور اپنے دیدار سے نواز گئی۔ چھٹے دن کی صبح وہ اس کا سودا سر میں لے کر اٹھا اور ایک ناشتہ فروخت کرنے والے کیبن میں ناشتہ کر کے

ونڈو شاپنگ کرنے نکل گیا۔ چلتے چلتے نجانے کِن کِن سواریوں میں چڑھتا اُترتا ایک مرتبہ پھر کنارِ آب پہنچ گیا وہ دن جادو کا تھا یا سہ پہر طلسماتی تھی کہ اس کے کافی فاصلے پر 'وہ' نظر آ گئی پانی کی موجوں پر حکمرانی کرتی ہوئی کوئی جل پری لیکن جل پری کا تو نچلا دھڑ مچھلی کا ہوتا ہے۔ وہ دیکھتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے وہ آنکھ بن گیا۔ سرتا پا آنکھ۔ اس کی سوچیں جو دن اور رات کے چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہتیں اسے تنہا چھوڑ گئیں۔ اس کے اینڈے بینڈے سوالات جو اس کے ذہن کو گھیرے رہتے تھے پانی کی ان چھوٹی بڑی موجوں میں گُم ہو گئے جو اس کے بدن پر واری واری جا رہی تھیں۔ اس کا اپنا کیا بنا؟ اوّل اوّل وہ آنکھ بن گیا تھا صرف آنکھ اور 'اس' کو دیکھنے میں مصروف رہا تھا۔ پھر شاید وہ دیکھ بھی نہ رہا تھا— صرف تھا— بعد میں وہ 'تھا' بھی نہیں صرف 'وہ' تھی—

آرٹ کی بین الاقوامی تنظیم 'اِلگرو' کی سہ سالہ تقریب حسبِ روایت پُر وقار تھی یہ دنیائے مصوّری کی سب سے منفرد، معتبر اور نمائندہ تنظیم کا خاص اجتماع تھا جس میں وقت کے سب سے بڑے مصور کے نام کا اعلان ہونے جا رہا تھا۔ ججوں کا پینل عصرِ موجود کے تمام بڑے نقادوں پر مشتمل تھا۔ فیصلے کا اعلان کرنے کے لئے ایک بزرگ خاتون کا انتخاب کیا گیا تھا جن کے خاندان نے فرانس کی قدیم ترین آرٹ گیلری کو اپنا مال و متاع اور اپنی زندگیاں دے دی تھیں— اس تقریب کی ایک خاص بات یہ تھی کی ججوں سے لے کر منتظمین اور حاضرین کے چہروں پر سنجیدگی اور سوگ طاری تھا— نقادوں کے پینل کے معمر ترین رُکن نے کھڑے ہو کر ہال میں طاری سکوت کو توڑا— ''جس مصور کے شاہکار کا آج انتخاب کیا گیا ہے اس کے پانچ فن پارے مقابلے میں شریک کئے گئے تھے۔ میں منصفوں کے پینل کے سب اراکین کی جانب سے اور خود اپنی جانب سے مختصر ترین اظہاریئے کے طور پر یہ اعلان کرتا ہوں کہ پانچوں کے پانچوں فن پارے بلا شبہ دنیائے مصوّری کے شاہکار ہیں۔ ان پر کسی بھی موجودہ یا قدیم مصوری کے مکتبۂ فن، تکنیک اور خیال کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ یہ قطعی طور پر مصوری کے جدید ترین اور منفرد ترین نمونے ہیں۔ ان پر تبصرہ نہیں کیا جا سکتا صرف ان کی تعریف کی جا سکتی ہے خاص طور پر ان میں سے ایک تصویر جسکا عنوان ''دخترِ آب'' ہے ایک ایسی لڑکی کی تصویر ہے جو پانی کی ایک موج بھی ہے اور لڑکی بھی— ایسی تصویر بنائی نہیں جاتی بن جاتی ہے— صدیوں میں کبھی کبھار— ایسے مصور بھی صدیوں بلکہ ہزاروں برسوں میں جنم لیتے ہیں۔ افسوس ہمارے دور کا یہ عظیم مصوّر— کل کسی موج آب کی گود میں جا کر ہمیں افسردہ چھوڑ گیا۔ میں آج کی مہمان خصوصی سے درخواست کرنے جا رہا ہوں کہ آج کی دنیا کے سب سے عظیم مصور کے نام کا اعلان کریں۔ براہِ کرم تالیاں نہ بجائیں صرف اپنی جگہ پر ساکت کھڑے ہو کر اس عظیم مصور کو ایک منٹ کے سکوت کا نذرانہ پیش کریں۔''

نام کا اعلان ہوا— اسی کا نام تھا۔ لوگ ایک منٹ کے لئے خاموش کھڑے رہے۔ بعد میں انتہائی پر وقار انداز میں انعام کی ٹرافی اور رقم کا چیک اس کی بیوی نے وصول کیا۔ ہال کے کسی گوشے میں کھڑے ہوئے مصور کے لب حرکت میں آئے ''گھوڑی'' لیکن اس کے منہ پر ایک نرم و نازک ہاتھ کی نرم و نازک انگلی ثبت ہوگئی۔ وہ ہاتھ اسی وُجود کا ہاتھ تھا جو پانی پر رقص کرتے ہوئے مصور کو بھی اپنے میں شریک کر چکا تھا۔ وہ بلا شبہ ایک لڑکی کا وجود تھا۔

☆☆☆

......ہونے کا درخت......

مقام اور وقت کے بارے میں کچھ بھی تو واضح نہیں ہے۔ میں قطعی نہیں جانتا کہ میں کب اور کہاں پیدا ہوا۔ میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ جب میں زمین سے اوپر نکلا تو مجھ کو یہ احساس ہوا کہ زمین سے باہر آنے کے باوجود میں زمین میں پیوست ہوں۔ میری جڑیں زمین کے اندر ہیں اور میں زمین سے بندھا ہوں۔ میں نے ان کیڑوں مکوڑوں، چیونٹیوں، کیچوؤں کو جنہیں آدمی حشرات الارض کے نام سے پکارتے ہیں، زمین کے باہر اور زمین کے اندر حرکت کرتے اور رینگتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اپنے ساتھ پیدا ہونے والے، اپنے ہم مقام اور ہم وقت چھوٹے بڑے جانداروں کو اور پرندوں کو دیکھا۔ وہ سب حرکت کرتے تھے، رینگتے تھے، اچھلتے کودتے تھے۔ بعض چلتے اور بعض ہوا میں اڑتے بھی تھے۔ میں اور مجھ سے کئی اور اپنے مقام سے حرکت کرنے پر قادر نہیں تھے۔ مجھے اس صورت حال سے بڑی مایوسی ہوئی— ''آخر میں نے اور مجھ جیسے دوسروں نے کون سا گناہ، کون سا جرم اور کیا خطا کی تھی کہ ہمارے پاؤں زمین میں گاڑ دئے گئے اور وہ بھی تا عمر۔''

میں نے سوچا— پیدائش کے دکھ کے بعد جو ہر خلق ہونے والے کو سہنا پڑتا ہے، یہ میرا دوسرا بڑا دکھ تھا، جس نے میرے وجود سے زندگی کی ساری امنگوں کو دور کر دیا تھا۔ شدید صدمے سے میں نے اپنا سر جھکا لیا۔ میرے پتے منھ لٹکا کر رہ گئے۔ میرا سینہ خمیدہ ہو گیا، میری کمر جھک گئی۔ میں نے سوچا کہ مادرِ ارض کی چھاتی سے لپٹ جاؤں اور لپٹا رہوں۔ اس وقت تک کہ مٹی کے ذرے اور کنکر پتھر میرے گنتی کے چند پتوں، نرم شاخوں، لچکدار سینے، میرے سارے ننھے منے وجود کو ڈھانپ لیں اور میں دھرتی کی امانت، دھرتی میں لوٹ کر ایک بار پھر مٹی ہو جاؤں لیکن ماں نے مجھے لپٹنے نہیں دیا اور پیار سے بولی ''میرے ننھے منے راج دلارے بیٹے! ابھی تم کو میرے بدن سے الگ ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا۔ ہر کوئی جو خلق کیا جاتا ہے وہ اپنا وقت ساتھ لے کر آتا ہے۔ ابھی تم ایک چھوٹے سے پودے ہو۔ ابھی تم کو بڑا ہونا اور پورا درخت بننا ہے۔ اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ!'' دھرتی ماں نے میری ہمت بڑھائی لیکن میں بحث کرنے لگا اور بولا۔

''لیکن ماں— یہ چھوٹے چھوٹے کیڑے، یہ بھی تو اللہ تعالٰی کی مخلوق ہیں اور یہ جانور، یہ پرندے حرکت کرتے ہیں۔ رینگتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں، دوڑتے بھاگتے ہیں، اچھلتے، کودتے ہیں، بعض اڑتے بھی ہیں— تو پھر میں بندھا ہوا کیوں ہوں—؟ آخر کیوں میں اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کر سکتا—؟ یہ کیسی قید ہے—؟ کیسی سزا ہے—؟ میں تو ابھی ابھی پیدا ہوا ہوں۔ مجھ سے ایسا کون سا گناہ، کون سا جرم سرزد ہوا ہے جس کی یہ سزا مجھے دی جا رہی ہے—؟'' میں نے ماں سے اپنے اصل دکھ کی وضاحت کی۔ اس مرحلے پر مجھے یوں لگا کہ جیسے مادرِ ارض نے مجھے جڑوں سے لے کر پتوں تک چوم لیا۔ اس ایک بوسے نے مجھے وہ توانائی بخشی کہ میں ایک بار پھر کھڑا ہو گیا اور اپنے ننھے وجود کے ساتھ ہوا میں رقص کرنے لگا۔

اس چھوٹی سی عمر میں بھی، میں یہ جان چکا تھا کہ مادرِارض بہت بڑی ہے۔ پوری ایک دنیا ہے۔اس سمے جب میں مادرِارض کے پیار کرنے پر زندگی سے بھرپور رقص میں مصروف تھا، یہ محسوس کیا کہ وہ مسکرارہی ہے اور بے حد خوش اور مطمئن ہے۔اسی خوشی اورطمانیت کی کیفیت کو جڑوں سے پتوں تک منتقل کرتے ہوئے وہ گویا ہوئی۔

''تم بے کار بددل ہو رہے میرے بچے— تم جو بظاہر ایک جگہ قائم ہو اصل میں تم بھی حرکت کر رہے ہو، اپنے چاروں اطراف اپنی جڑوں کے ذریعہ۔ جیسے جیسے تم بڑے ہوتے جاؤ گے، اپنے حرکت کرنے کو جانتے جاؤ گے۔اپنی رینگتی جڑوں کو پہچان لوگے۔ یہاں سے کچھ دور ایک ندی بہہ رہی ہے۔تم دیکھنا تھوڑے ہی عرصے بعد تم اپنی ان زمین دوز ٹانگوں کی مدد سے اس ندی تک پہنچ جاؤ گے۔''

یہ سب کچھ ماں نے بڑے وثوق سے کہا۔

''سچ ماں''میں چہک کر بولا۔

''ہاں بیٹے تم ندی تک ضرور پہنچ جاؤ گے۔تم اپنے چاروں طرف دور دور تک جاؤ گے۔تم بھی دوسرے جانداروں کی مانند حرکت کرو گے۔زمین کے اندر، اندر اپنی جڑوں کی مدد سے اور باہر اپنے تنے شاخوں اور پتوں کی مدد سے۔''ماں نے ایک مرتبہ پھر مجھے مثبت سوچوں اور امیدوں کی جانب ڈھکیلا لیکن میرے اندر ایک کانٹا سا چبھ رہا تھا اور اس کی چبھن کے زیر اثر میں نے ماں سے یہ شکوہ کیا—

''لیکن ماں مجھے یہ قید بہت بری لگتی ہے۔کیا اس قید سے مجھے آزادی نہیں مل سکتی۔کبھی بھی نہیں۔''میں نے ماں سے ضد کی۔

''میرے بیٹے! میں تجھے کس طرح سمجھاؤں۔ابھی تو ان معاملات کو سمجھنے کے لئے بہت چھوٹا ہے۔جس کو تو قید کہتا ہے میرے لعل وہ قید نہیں ہے، وہ تیرا ہونا ہے، تو اپنے ہونے میں قید ہے، ہر کوئی جو یہاں ہوتا ہے وہ اپنے ہونے کے اندر قید ہوتا ہے۔اپنے اپنے انداز میں، جس طرح کا ہونا، اس طرح کی قید۔ میں بھی ہوں، سو میں بھی قید ہوں۔تو زمین سے جڑا ہوا ہے، یہ تیرے ہونے کا انداز ہے۔میں گردش میں ہوں، یہ میرے ہونے کا انداز ہے۔ جہاں تک حرکت کا تعلق ہے، سب حرکت میں ہیں۔تو بھی حرکت میں ہے، میں بھی حرکت میں ہوں، جو ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی انداز کی حرکت میں ہوتا ہے اور تو اور جمادات بھی، کنکر، پتھر، چٹانیں، پہاڑ وغیرہ جو تجھ سے کہیں زیادہ جامد اور غیر متحرک نظر آتے ہیں، اپنے اپنے اندرون میں متحرک ہیں۔ ہم سب لاکھ حرکت میں ہوں، ہم سب قید ہیں۔سارے ہونے والے قید ہیں، وہ جو زمین میں ہیں، وہ جو زمین کے اوپر ہیں، ہواؤں میں ہیں، پانی میں ہیں، فضا میں ہیں، خلاؤں میں ہیں، سارے ایسی ڈوریوں سے بندھے ہیں جو دکھائی نہیں دیتیں۔غیر مرئی ہیں اور یہ ڈوریاں اس کے قابو میں ہیں جو سب کا خالق ہے، لیکن یہ ساری باتیں میں تجھ سے کیوں کہہ رہی ہوں—؟ ابھی تو ان باتوں کے لئے بہت چھوٹا ہے—اب جا—تو اپنے ہونے میں ہو—''

ماں سچ کہہ رہی تھی۔میں ان باتوں کے لئے ہنوز بہت چھوٹا تھا، لیکن ان کو پوری طرح سمجھنے کے لائق بڑا— میں کبھی نہ ہو سکا یا پھر بڑا ہونے کے ساتھ ساتھ اور ہی طرح کی باتوں میں الجھتا گیا کہ ان باتوں کی جانب متوجہ ہونے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ ہونے کے مرحلے سے گزرنے کے بعد میں 'بڑا' ہونے کے مرحلوں سے گزرتا گیا۔میرے بڑے ہونے، زمین سے اوپر اٹھنے میں اگرچہ مجھے شاخ شاخ ہونے کے آشوب سے بھی گزرنا پڑا لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میں فربہ بھی ہوا، لمبا بھی ہوا اور گھنا بھی۔ مجھ پر چھتریاں سی اگتی چلی گئیں اور جب

چھتریاں گھنی ہو کر آپس میں مربوط ہو گئیں تو شاخوں، ڈالیوں اور پتوں سے، اچھا خاصا ہرا بھرا سائبان تعمیر ہو گیا۔ میری آبادی میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ رینگنے والے چھوٹے بڑے وجودوں نے تو آغاز ہی سے مجھ میں اور مجھ پر رہنا بسنا شروع کر دیا تھا لیکن جیسے جیسے میری چھت پھیلی اور میں چھتنار ہوتا گیا مجھ پر اور مجھ میں بڑے حشرات الارض رہنے سہنے لگے۔ بھانت بھانت کے پرندے، گھونسلے بنانے والے اور گھونسلے بنائے بغیر گزر بسر کرنے والے آباد ہو گئے۔ ساتھ ہی چند ایک چوپائے بھی میرے پتوں، نرم ٹہنیوں پر منھ مارنے والے مجھ سے متعارف ہوتے گئے۔ بکریاں جنکا پیٹ ہی نہیں بھرتا مجھ سے لپٹی رہتیں۔ ان سب کے علاوہ میرے نیچے، میری چھاؤں میں آدم زاد بھی ڈیرا جمانے لگے تھے۔ مجھے ان آدم زادوں کے بچے، بچیوں کا آنا بہت بھاتا، ان چڑیوں سے بھی زیادہ جو پو پھٹے میری اس چھوٹی سی بستی کو اپنی آوازوں سے بیدار کیا کرتی تھیں۔ میرے نیچے۔ بچے، بچیاں، لڑکے، لڑکیاں طرح طرح کے کھیل کھیلتے۔ بڑے لڑکے، لڑکیاں اپنی جوانی کے ڈرامے کے ابتدائی مناظر کی بساط جماتے۔ بوڑھے حقے گڑگڑاتے، چلمنیں پھونکتے اور بستی کی عورتوں اور لڑکیوں کے گرما گرم اسکینڈل سنتے سناتے یا ایجاد کرتے۔

بڑے ہونے کے مرحلے سے گزرنے کے دوران میں زیادہ سے زیادہ سمجھدار ہوتا گیا۔ جسمانی بڑھوتری، وسعت اور بلندی کو اور جسمانی حرکت کو ہی سب کچھ خیال کرنے والا 'میں' اس حقیقت سے آشنا ہوا کہ جسمانی بڑھوتری کے علاوہ بھی بڑے ہونے کی متعدد دوسری صورتیں اور حالتیں ہیں جیسے ذہنی طور پر بڑا ہونا، جذباتی اور حسّی طور پر بڑا ہونا۔ چونکہ دھرتی ماتا نے مجھ میں صبر، ضبط اور رسان ڈال دی تھی۔ اس سبب سے گھبرا جانے اور مایوس ہونے کی منفی کیفیتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لائق ہو گیا تھا۔ میں نے ایک بنیادی سچائی سے آگاہی پیدا کر لی تھی اور یہ جان چکا تھا کہ ہونے کو سہنا بھی ہونے کے لوازمات میں شامل ہے۔ اول اول میں صرف اپنے ہونے میں جٹا رہا پھر یوں ہوا کہ میرے ہونے سے، بہت سارے اور ہونے والے مجھ سے جُڑتے چلے گئے۔ جوں جوں میں بڑا ہوتا گیا مجھ سے جُڑے ہوئے ان ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ وقت بھی آیا کہ ان کے ہونے کا ادراک کرنا بھی میرے بس کی بات نہیں رہی۔ اسی دوران میرے مشاہدے میں تواتر کے ساتھ ایک تکلیف دہ حقیقت آئی اور مختلف اور متنوع صورتوں میں آئی کہ میں شدید صدمے سے دوچار ہونے لگا۔ میرے بدن پر چھوٹے بڑے کیڑے شروع ہی سے ادھر ادھر رینگتے پھرتے تھے۔ وہ زمین کے اندر میرے نچلے دھڑ کے ساتھ ہوتے تھے اور زمین کے اوپر میرے بالائی دھڑ پر بھی ہوتے تھے۔ میں نے محسوس کیا میرے اپنے بدن پر مخصوص اقسام کی چھپکلیاں، گرگٹ اور چند ایک بڑے جسموں والے حشرات الارض آ کر بس گئے اور ان کیڑوں کو موت کے گھاٹ اتارنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ میری شاخوں پر رہنے والی چڑیاں اور پرندے صبح سویرے زمین پر اتر کر ان کیڑوں کو لقمۂ اجل بناتے تھے میں نے یہ بھی دیکھا کہ جانے کہاں کہاں سے چیلیں اور عقاب سورج کے نکلنے سے قبل میری شاخوں اور پتوں پر سوئی ہوئی چڑیوں اور چھوٹے پرندوں پر جھپٹّے مار کر انہیں لے اڑتے۔ میں نے یہ بھی دیکھا خوبصورت چال میں مٹکنے والے اور غٹرغوں کرنے والے کبوتروں، ہوکتی فاختاؤں اور گانے والی بلبلوں کو حسین جسموں اور جادوئی پھنوں والے ناگ اور ناگنیں اپنے اندر اتار لیتیں۔ میں جو بلّیوں کو مراقبہ کرتے ہوئے دیکھ کر ان کا احترام کرنے لگا تھا یہ دیکھ کر لرز اٹھا کہ ایک بلّی اپنا مراقبہ توڑ کر کسی چڑیا پر جھپٹی، پلک جھپکتے میں اس کے پر نوچ کر الگ کئے اور غڑپ کر گئی۔ میرے پتوں نے ہوا کے ساتھ مل کر

ماتمی حلقے بنالئے جو دکھ مجھے پہلی پت جھڑ کے دوران ہوا تھا وہ میرے ان خوفناک اور المناک مشاہدوں کے آگے کچھ بھی تو نہ تھا۔قریب تھا کہ ایک مرتبہ پھر اپنی منفی سوچوں میں ڈوب جاؤں دھرتی ماتا خود ہی میری جانب متوجہ ہوگئی۔دھرتی ماتا کو اپنی جانب متوجہ پا کر میں نے پتوں پر پڑی ہوئی شبنم کے بے شمار آنسو ماں کی گود میں ٹپکا دئے اور ان بھیانک مشاہدوں سے اس کو آگاہ کرتے ہوئے پوچھا ''یہ سب کیا ہے ماں۔یہ میں کیا دیکھتا ہوں۔؟ ان ننھے ننھے معصوم کیڑوں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے جو پرندے ان کو اپنی چونچوں میں اٹھا لیتے ہیں۔؟'' دھرتی ماں نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا صرف مادرانہ شفقت سے مجھے دیکھتی رہی ایک کے بعد ایک میں نے اپنے سارے تلخ مشاہدات دھرتی ماں کو سنا دئے اور جب کثرت سے مراقبے میں مصروف ہونے والی بلّی کی سفا کی تک پہنچا تو اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور روتے روتے نڈھال ہوگیا۔دھرتی ماں نے مجھے اپنی محبت کے حصار میں لے لیا۔میں نے محسوس کیا جیسے میں کوئی نوزائیدہ ننھا وجود تھا اور دھرتی ماں مجھے اپنی گود میں لٹا کر گیت سنا رہی تھی۔

''میرے بیٹے۔مت رو، مت رو
راج دلارے۔مت رو۔مت رو
تم اب تک 'ہونے' میں رہے تھے
اور فقط 'ہونا' دیکھا تھا
ہونے کی گودی میں چندا
ہونا ہی، ہونا، ہوتا تھا
سپنوں میں کھونا ہوتا تھا
''میرے بیٹے۔مت رو، مت رو
راج دلارے۔مت رو۔مت رو
تم نے جو دیکھا ہے، چندا
لگتا ہے جو بھیانک سپنا
ہر ہونے کے ساتھ لگا ہے
وہ ہونے کا انت ہے پیارے
اور 'نہ ہونا' کہلاتا ہے
'ہونا' اور 'نہ ہونا' دونوں
ہوتے ہوئے بھی ہوتے نہیں ہیں
اچھے بچے روتے نہیں ہیں

''میرے بیٹے۔مت رو،مت رو

راج دلارے۔مت رو۔مت رو

دھرتی ماتا نے گانا بند کیا اور مجھے پیار سے دیکھا۔اس دوران میں نے رونا بند کر دیا تھا۔اپنی آنکھوں کے آنسو خشک کر لئے تھے۔اگر چہ ماں نے گیت کی مدھرتا میں لپیٹ کر زندگی کی چند بڑی لیکن کڑی سچائیوں کو میری سماعت اور ذہن میں انڈیل دیا تھا لیکن میری تشفی نہیں ہو سکی تھی ''ماں مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔کیا میں بھی 'نہیں' ہو جاؤں گا۔؟''

میں نے ماں سے سیدھا سوال کر ہی دیا۔

''میں نے کہا نا— ہر ہونے کو ایک دن نہ ہونا ہے۔''

''تو بتاؤ ماں۔میں کب 'نہ ہونے' کے مرحلے سے گزروں گا۔؟''

''میرے چندا۔یہ میں نہیں بتا سکتی۔میں خود اپنے بارے میں یہ نہیں بتا سکتی کہ میں کب نہ ہونے کے مرحلے سے گزروں گی۔؟''

''ایسا کیوں ہے ماں۔؟''

''ایسا اس سبب سے ہے بیٹے کہ تم اور میں،ہم دونوں اپنی مرضی سے نہیں ہیں اور بیٹے تم اور میں دونوں اپنے اپنے وقت پر 'نہ ہونے' کا مرحلہ گزاریں گے اس کی مرضی کے مطابق جس نے ہمیں 'ہونے' کے مرحلے میں ڈالا تھا۔''

میں نے دھرتی ماں سے کچھ اور پوچھنا لا حاصل جان کر چپ سادھ لی اور دھرتی ماتا نے بھی خاموش رہنا مناسب خیال کر لیا۔اس کے بعد میرے رویے میں تبدیلی آئی اور میں اپنے ہونے میں رہتے ہوئے ہر روز ہی نہیں،ہر لمحہ دوسروں کے ہونے اور نہ ہونے کا مشاہدہ کرنے لگا۔پھر تو میرا یہ حال ہوا کہ اندھیرے کو اجالے کے پیٹ سے اور اجالے کو اندھیرے کے پیٹ سے پیدا ہوتے دیکھتا،رات سے دن کو،دن سے رات کو جنم لیتے دیکھتا۔سردی کی کوکھ سے گرمی،گرمی سے سردی،بہار سے خزاں،خزاں سے بہار پیدا ہوتے ہوئے نہ صرف محسوس کیا بلکہ موسموں کے چکر سے واقف ہو گیا۔مشاہدوں کے تسلسل سے آخر کار میں سوچ کے اس مرحلے پر جا کر پریشان ہو گیا جس میں ہونے اور نہ ہونے کا تواتر میرے پیش نظر تھا۔جب میں نے اپنی اس پریشانی کا دھرتی ماں سے ذکر کیا تو وہ ہنس پڑی اور بولی۔

''بس بس میں سمجھ گئی۔اب میرا بیٹا صحیح معنوں میں بڑا ہو گیا ہے۔''

''صحیح معنوں میں بڑا ہو گیا ہے۔؟ صحیح معنوں میں کس طرح بڑے ہوتے ہیں۔؟''

''تم نے ہونے اور نہ ہونے کو بھرپور طریقے سے محسوس کر لیا ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ تم بڑے ہو گئے ہو۔''

''صاف صاف بتاؤ ماں۔آج آپ پہلی مرتبہ میرے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب نہیں دے پا رہی ہو۔''

''بیٹا۔ہونا اور نہ ہونا نت نئے رخ اختیار کرتا ہے اور پوری کائنات اس کی مختلف جہتوں سے معمور ہے۔رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات آنے کا یہ مطلب نہیں کہ دوبارہ جو رات آتی ہے وہی پہلے والی رات ہوتی ہے اور جو دن آتا ہے وہی گزرا ہوا دن ہوتا ہے۔میرے

بھولے بھالے بیٹے جب تم بڑے ہی ہو گئے ہو تو یہ بھی جان لو—— جو رات بھی آتی ہے، جو دن بھی طلوع ہوتا ہے وہ نیا ہی ہوتا ہے—— پرانا نہیں۔آج جو چاند آسمان پر چمکے گا وہ ڈوبے گا تو پھر نہیں ابھرے گا۔آج جو سورج چمک رہا ہے غروب ہو کر پھر طلوع نہیں ہوگا۔میں زمیں ہوں۔یہ مانا کہ میرا ایک ہی چاند ہے اور جس نظام شمسی میں ہوں اس کا سورج بھی ایک ہی ہے لیکن وقت اپنا کام کرنے سے نہیں رکتا اور وقت ہی ہے جو ہر صبح کے سورج کو نیا اور ہر رات کے چاند کو نیا روپ دے دیتا ہے۔وقت کے زیر ہر رُت نئی ہی ہوتی ہے۔پرانی کوئی بھی رُت لوٹ کر نہیں آتی۔وقت کے زیر اثر تم ہر لمحہ بدل رہے ہو اور میں بھی۔میں ہر لمحہ نئی 'میں' ہوں تم ہر لمحہ ایک نئے 'تم' ہو۔میرے بیٹے۔یہ ہر روز کا نیا پن ہی ہونے سے نہ ہونے تک ہمارے بتدریج اور مسلسل سفر کا شاہد ہے اور ثبوت بھی۔ہر بدلنے میں اور نئے ہونے میں 'نہ ہونا' چھپا ہوا ہے۔''

''ماتا میری۔کیا 'نہ ہونا' اٹل ہے۔؟''

''ہاں یہ اٹل ہے۔میرے بچے—— لیکن یہ سب......''

''یہ سب آپ کہتے کہتے رک کیوں گئیں۔؟''

''یہ سب گمان ہے۔''

''گمان......؟''

ہاں میرے بیٹے۔یہ سب......اور تمہارا، میرا ہونا بھی محض گمان ہے صرف ایک مفروضہ۔'' اتنا کہہ کر دھرتی ماں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔میں نے ماں کے چہرے کو غور سے دیکھا اور سوچا '' مجھے اس گمان والی بات پر بحث جاری نہیں رکھنی چاہئے۔ماں پہلے ہی اداس ہے ۔دکھی ہے۔اس موضوع پر مزید گفتگو سے مزید دکھی ہو جائے گی۔

اس مقام پر میں نے ماں سے رخصت چاہی۔

میں اپنے آپ کو اور اپنے نیچے، اوپر اور اطراف پھیلے ہوئے وجودوں کو محض '' گمان'' تسلیم کرنے کی حالت میں نہیں تھا اور نہ کبھی ہو سکا البتہ دوسروں کے بارے میں سوچنا میں نے ترک نہیں کیا۔دوسروں کے بارے میں سوچنے سے میں نئے نئے دکھوں اور نئی نئی خوشیوں سے آشنا ہوتا چلا گیا۔اصل بات یہ تھی کہ آدم زادوں کو میری چھاؤں راس آنے لگی تھی۔وہ اپنے دکھوں اور خوشیوں کے ساتھ میرے سائبان تلے آنے جانے لگے تھے۔ان میں قابل ذکر ایک لڑکا ،لڑکی تھے۔وہ میرے نیچے ایسے وقت آتے جب کسی اور آدم زاد کے آنے کے امکانات نہ ہوتے۔ظاہر تھا وہ چوری چھپے ملتے تھے اور کبھی دیر تک ،کبھی تھوڑے وقت ساتھ رہتے لیکن جتنی دیر بھی رہتے ایک دوسرے میں گم رہتے۔بہت جلد میں ان کے چھوٹے بڑے بے شمار رازوں کا امین ہو گیا تھا۔جس طرح وہ دونوں ایک دوسرے کے ہو رہے تھے میں ان دونوں کا ہو رہا تھا۔میری نئی نویلی ٹہنیاں، ڈالیاں اور پتے ان کی خوشیوں اور غموں میں شریک ہونے لگے تھے۔وہ جب ہم آغوش ہوتے تو میں دیوانہ وار رقص کرتا، وہ جب دکھی ہوتے تو میں بلک بلک کر روتا۔پھر ایک منحوس دن وہ لڑکی تنہا آئی ،میری ایک ڈالی کو پکڑ کر کھڑی روتی رہی میں بھی رویا لیکن جب وہ میرے بدن سے لپٹ کر روئی تو میں اپنے سارے وجود سے ماتم کرنے لگا۔وہ ہمیشہ کے لئے مجھے چھوڑ کر چلی گئی کبھی

لوٹ کر نہیں آئی۔ بہت جلد میرے نیچے آنے جانے والے آدم زادوں کی باتوں سے مجھے پتہ چل گیا کہ لڑکا جبری فوجی بھرتی میں دھر لیا گیا تھا۔

ایک دن ایک سادھو نما شخص میرے نیچے آیا۔ اس نے آتے ہی میرے بدن کے ساتھ ایک پتھر کھڑا کیا، اس پر سیندور سے کچھ نقش بنائے اور اس کی جانب منہ کر کے پوجا کے آسن میں ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر اس طرح عبادت کر کے دوسری جانب کھسک کر مجھ سے ٹیک لگا لی۔ آنکھیں بند کر کے نیم دراز پڑا رہا۔ گم صم، سویا نہیں لیکن جھپکی ضرور لی۔ بیدار ہو کر دو تین انگڑائیاں لیں، سرہانے دبی پوٹلی سے، مٹی کا پائپ، تمباکو کی چرمی تھیلی اور ایک ڈبیہ کسی بھورے رنگ کے سفوف کی برآمد کی۔ اکڑوں بیٹھ کر مٹی کے پائپ میں تمباکو اور سفوف دبا دبا کر بھرا رومال کے ایک گوشے میں بندھی ماچس کی ڈبیہ نکال کر پائپ کو آگ دکھائی، پائپ سے دھواں حلق میں لے کر باہر پھینکتا رہا۔ پہلے چھوٹے چھوٹے، بعد میں لمبے کش لئے۔ جیسے وہ کش لیتا، اس کے گلے کی نسیں تن جاتیں، گالوں میں دو غار سے بنتے اور آنکھیں ماتھے پر چڑھ کر لال انگارہ ہو جاتیں، پائپ پیتے ہوئے وہ زور زور سے کھانستا، کروٹ لے کر تھوک اور بلغم باہر پھینکتا، پھر دنیا مافیہا سے بے خبر قریب بے ہوش ہو جاتا۔ جب ہوش میں آتا، اٹھتا اور میری بصارت سے پرے جانے کیا کرتا پھرتا۔ کبھی کبھی وہ میری سرحدِ ادراک میں آیا تو لٹیا میں ایک بکری کا دودھ نچوڑ رہا تھا۔ آدم زادوں کے مسائل میں سے ایک مسئلہ ان کے پیٹ کا ہے جن کے لئے غلط اور صحیح بے شمار کام کر گزرتے ہیں۔ میرے مشاہدے کا ہدف، آدم زاد ہو گئے تھے اور میں ان کو ترجیح دینے لگا تھا۔

اس سادھو نما آدمی سے میری دلچسپی بڑھ گئی۔ اس کی حرکات وسکنات سے صاف پتہ چلتا تھا وہ نیچے طویل قیام کا فیصلہ کر چکا تھا۔ سورج نکلنے سے پہلے بیدار ہوتا اور کان میں جینوا ٹکا کر جھاڑیوں میں گھُستا، جھاڑیوں سے باہر نکل کر، ندی کا رخ کرتا، اشنان کرتا اور پانی میں کھڑے ہو کر تری مورتی کا زور زور سے جاپ کرتا ''برہما، وشنو، مہیش'' جس کی آواز مجھ تک پہنچتی البتہ سوریہ دیوتا کے لئے جو اشلوک پڑھتا وہ دبی آواز میں ہوتے اور مجھ تک نہیں پہنچتے۔ آدم زادوں کی زندگی میں اور باتوں کے علاوہ یہ بات دوسری مخلوق سے قدرے مختلف دیکھنے میں آئی کہ غیر متوقع واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ اس سادھو نما آدمی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ مجھے توقع نہیں بلکہ یقین تھا کہ وہ میرے نیچے طویل مدت گزارے گا۔ ابھی میں اس سے پوری طرح واقف بھی نہ ہو سکتا تھا کہ مقامی زمیندار کے چند سوار آئے اور سادھو کو اس کی پوٹلا، پاٹلی کے ساتھ گھوڑے کی پشت پر ڈال کر لے گئے۔ میں تو اس کے بارے میں یہ بھی نہ جان سکا تھا کہ وہ کون تھا، عام آدمی، سادھو سنت، کوئی بھوکی جو یوگی بن گیا ہو یا پھر منتر جنتر کو ہی سب کچھ ماننے والا کوئی تانترک — میرے نیچے آنے جانے والے آدم زادوں سے تو صرف یہی سُن پایا کہ وہ سونا بنانے والے کی شہرت کا مالک تھا۔ مشہور تھا کہ وہ جب اپنے مٹی کے پائپ سے کش لگاتا ہے تو تانبے پیتل کا سکہ اڑ جاتا ہے اور اس کی جگہ خالص سونے کے ذرات مٹی کے پائپ میں چپکے رہ جاتے ہیں۔ لوگ اس کو یاد کر کے بہت دنوں ہنستے بولتے رہے تھے۔

''زمیندار اسے پٹوا پٹوا کر سونا بنوا رہا ہوگا۔ سالا بڑا سادھو سنت بنتا تھا — ہاہا۔ ہاہا......''

سادھو کے پکڑے جانے کے بعد میں نے اپنے نیچے ایک خلا سا محسوس کیا۔ میں نے اس دھات کے بارے میں بھی سوچا جو کسی کام کی نہیں ہوتی لیکن آدم زاد اس پر جان دیتے اور جان لیتے ہیں۔ ''مادرِ ارض کے پاس تو بہت سارا سونا ہے'' میں نے یہ بھی سوچا۔

اس سادھو کے پکڑے جانے کے بعد میرے نیچے ایک درویش آ بیٹھا چند روز بعد معلوم ہوا۔ کہ وہ میرے نیچے چلّہ کرے گا، چالیس روز کا چلّہ۔ بڑا خوبصورت، گوراچٹا آدمی تھا۔ اس کے بال اس سادھو نما شخص کے بالوں کی مانند لمبے ضرور تھے لیکن وہ ان میں ہر روز کنگھی پھیرتا تھا اور دن میں کئی مرتبہ ایک چھوٹے سے آئینے میں دیکھ کر اپنی ریش بھی سنوارتا تھا۔ درویش کو بھی سلام کرنے کے لئے لوگ آنے لگے۔ مرد بھی اور عورتیں بھی جس طرح اس سادھو نما کے لئے آنے لگے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس کو بھی زمیندار کے سوار لے جائیں گے لیکن چند ایک ہفتے گزرنے کے بعد بھی زمیندار کے سوار نہیں آئے تو مجھے اطمینان ہو گیا۔ میں چاہتا تھا وہ درویش میرے نیچے، ہمیشہ کے لئے بس جائے۔ وہ لوگوں سے بات چیت نہیں کرتا تھا۔ بس ہوں، ہاں کرتا البتہ ہر کسی کو دیکھ کر پیار سے مسکرا دیتا۔ عورتوں اور لڑکیوں کو ایک فاصلے پر روک دیتا۔ سب کی بپتا اور منتوں کو آنکھیں بند کر کے سنتا۔ بوڑھوں، بوڑھیوں کو بھی بیٹا، بیٹی، پتر، پتری کہہ کر مخاطب ہوتا اور کہتا۔

''آپ بھی دعا کرو، بابا بھی دعا کرے گا۔ اب جاؤ بابا کو کام کرنے دو۔''

وہ کوئی کام نہیں کرتا۔ لوگ باگ۔ اس کے لئے روٹی، دال بھات، پھل، مٹھائی اور کھیت سے توڑی ہوئی گاجر، مولی اور نہ جانے کیا کیا لے کر آتے وہ تھوڑا تھوڑا چکھ کر وہاں موجود لوگوں میں اسی وقت تقسیم کروا دیتا۔ دوسرے دن کے لئے بچا کر نہیں رکھتا تھا۔ لوگوں کی حاجات پوری ہونے لگی تھیں یا درویش کی مقناطیسی شخصیت کا اثر تھا کہ اس کو سلام کرنے کے لئے آنے والوں میں روز بروز اضافہ ہونے گا کبھی کبھی تو اچھا خاصا مجمع لگ جاتا حالانکہ وہ سارا علاقہ جو فوجی نقل و حرکت اور ہوائی حملوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میں اپنے نیچے کی آبادی میں اضافے سے خوش تھا لیکن ایک انتہائی گرم دن وہ درویش آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا اور شاید کچھ ورد کرنے میں مشغول تھا۔ آس پاس کوئی نہ تھا سوائے ایک موٹی کالی بلّی کے جو میری ایک ڈال پر اپنی دم نیچے لٹکائے بیٹھی تھی۔ مجھ پر کچھ زندہ وجود تھے بھی تو وہ سب کے سب بے حس و حرکت اور چُپ تھے۔ چڑیوں نے بھی چوں چوں بند کر رکھی تھی۔ اچانک ایک لڑکی جانے کہاں سے آ گئی۔ وہ اس طرح دبے پاؤں آئی کہ درویش کو جو اپنے وظیفے میں گم تھا، لڑکی کے آنے کا احساس بھی نہ ہو سکا۔ لڑکی درویش کے چہرے پر جھکی اور اس کا ماتھا چوم کر الٹے قدموں چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد وہ درویش کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر ایک چھوٹے سے حلقے میں دوڑتا رہا پھر دوڑنا بند کر کے اس نے اپنی چھڑی سے اپنے ہی بدن پر ضرب لگائی۔ اپنی اس پٹائی سے فارغ ہو کر اپنا مختصر اسباب سمیٹا، پوٹلی سی باندھی، پوٹلی کو چھڑی سے پرویا، کندھے پر لا دا اور پلک جھپکتے میں، میرے نیچے سے رخصت ہو گیا۔ مجھ پر آباد وجودوں نے اگر یہ سب دیکھا بھی تو چپ سادھے رہے کیونکہ وہ یا میں — کر بھی کیا سکتے تھے، ہونے کے ساتھ ہونی بھی تو لگی ہے۔

دوسرے دن دوپہر میں وہ لڑکی آئی۔ درویش کو موجود نہ پا کر اس مقام پر ماتھا ٹیکا جہاں وہ بیٹھا کرتا تھا۔ کچھ دیر سجدے کی حالت میں پڑی رہی اور پھر چپ چاپ اٹھ کر چلی گئی۔ میں نے اپنی ڈالیاں اور پتے ہلا کر اور مجھ پر اور مجھ میں بسے ہوئے بے شمار وجودوں نے اپنے اپنے انداز میں اس لڑکی سے شکوہ کیا لیکن لڑکی اپنے المیے میں گُم ہم سب سے بے خبر رہی۔ اگر لڑکی اس طرح نہ آتی اور وہ سب نہیں کرتی جو اس نے کیا تو شاید وہ درویش میرے نیچے اپنا تکیہ بنا لیتا۔ شاید۔ شاید۔ شاید دور کسی چٹان کی نوک پر کوئی چیل چیخ چیخ کر اپنے رفیقِ حیات کو آواز دے رہی تھی۔ درویش کے جانے کے بعد، عین اس کے چلّے کی جگہ ایک انتہائی حسین بلّی ہر روز مراقبہ کرنے لگی۔ کچھ دن بعد اس بلی

نے بھی آنا ترک کر دیا۔ جانے کیوں مجھے یوں لگا کہ اس حسین بلّی نے درویش کا چلّہ پورا کیا۔

میرے نیچے یوں تو صد ہا ٹھہرنے والے بشمول آدم زاد ٹھہرے لیکن ایک میاں بیوی کے جوڑے کو میں کبھی نہ بھول سکا۔ وہ بہت کم وقت کے لئے آئے اور چلے گئے۔ دونوں ڈھلتی عمروں کے تھے۔ مرد قدرے فربہ لیکن گھٹے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس کا چہرہ بڑا— گندمی رنگت، بڑی بڑی مونچھوں اور سرخ لہو رنگ آنکھوں سے نہ بھولنے والا ہو گیا تھا۔ دونوں ایک ہی گھوڑے پر سوار ہو کر آئے تھے۔ مرد نے گھوڑے کو مجھ سے باندھا اور وہاں سے تیز قدموں چلا گیا۔ عورت میرے قریب ہی کہیں بیٹھ رہی لیکن چادر سے پوری طرح چھپی ڈھکی۔ کوئی آدھ گھنٹہ گزرا ہو گا کہ مرد واپس آیا۔ اس کا گندمی چہرہ کامیابی کی چمک سے دمک رہا تھا لیکن آنکھوں سے خون ٹپکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کو دیکھ چادر میں لپٹی عورت چھپٹ کر اٹھی اور کھڑی ہو گئی۔ عورت کے کھڑے ہونے کے ساتھ ہی ان کا گھوڑا جو پوری طرح بیٹھا تھا اور نہ ہی کھڑا تھا ایک دم کھڑا ہو گیا اور اپنی اگلی ٹانگوں کو اٹھا کر، گھٹنوں سے موڑ کر، اپنے حلق سے ایک خاص آواز نکال کر اپنے مالک کو پیغام دینے لگا کہ وہ پوری طرح چاق و چوبند اور سواری کے لئے تیار ہے۔

''کام ہو گیا'' مرد نے عورت سے کہا ''یہاں سے جلدی نکل چلو ہمارا تعاقب ضرور ہو گا''۔

''نہیں— پہلے میں اس ملعون کا منہ دیکھوں گی۔'' عورت غرائی، مرد نے عورت کی جانب نظر گھمائی۔ عورت کی چادر ڈھلک گئی تھی، عورت کی بڑی بڑی آنکھیں اس کے پورے چہرے پر پھیلنے کے ساتھ باہر ابل پڑی تھیں۔ ان سے آگ کی سی لپٹیں باہر آ رہی تھیں۔ مرد کی لہو چکیدہ آنکھیں عورت کی آنکھوں سے ٹکرا کر جھک گئیں۔

''تم عورت ہو یا—'' مرد بولتے، بولتے رک گیا۔

''میں شیرنی ہوں— میں نے اپنا شیر بیٹا کھویا ہے— اکلوتا بیٹا— جلدی کرو۔ مجھے وہ خبیث سر دکھاؤ— میرے بیٹے کے قاتل کا سر— اس شیطان چہرے کو دیکھے بغیر— میں یہاں سے نہیں ٹلوں گی—'' مرد نے اپنی بیوی کی آواز سنی اور سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ یہ آواز وہ اپنی طویل ازدواجی زندگی میں پہلی بار سن رہا تھا۔ ایک مکمل غیر انسانی آواز— جس میں تحکم تھا۔ اس نے ایک ہی جھٹکے سے اپنی بغل سے لٹکا ہوا چرمی تھیلا نکالا۔ دوسری ہی لمحے اس کے سیدھے ہاتھ میں ایک جوان آدمی کا سر تھا، جس کو اس نے بالوں سے پکڑا ہوا تھا۔ کٹی ہوئی گردن سرخ و سیاہ خون سے آلودہ تھی۔ چہرے پر دہشت کی چھاپ تھی۔ بے جان آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ ناک ٹیڑھی ہو چکی تھی۔ دہانہ کھلا تھا، جس کے اندر سے سرخ زبان کی نوک اور سفید دانت جھانک رہے تھے، کالی گھنی موچھوں کے نیم حلقے سے گھرے ہوئے۔ تھوڑی جس پر خشخشی داڑھی تھی، گردن کی جانب لٹک گئی تھی۔ عورت نے پہلی مرتبہ چادر کو بدن سے الگ گرا دیا اور اس گردن سے کٹے ہوئے چہرے کی طرف لپکی۔ گھوڑا جو شاید ماحول کی دہشت کو سونگھ چکا تھا۔ اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا اور اپنی تھوتھنی آسمان کی طرف اٹھا کر چینجا۔ گھوڑے کی اس آواز کو ہنہنانا نہیں کہا جائے گا۔ میرے پتے بھی چلانے لگے اور میرے اوپر اور میرے اندر رہنے والے سارے وجود اپنے اپنے طور پر بین کرنے لگے۔ عورت کو سر کی جانب بڑھتا دیکھ کر، مرد تیزی سے پیچھے ہٹا اور چلایا۔

''پرے رہو— پرے رہو— ہاتھ نہیں لگاؤ— دور— دور'' عورت نے مرد کی آواز پر کان نہیں دھرے۔ مرد کے ہاتھ سے لٹکے ہوئے

سر پر بپھری ہوئی شیرنی کی مانند جھپٹی— مرد پیچھے ہٹا۔عورت نے اس کٹے ہوئے سر کے منہ پر تھوک دیا اور غیض وغضب کی حالت میں چیخ چیخ کر کچھ ایسے الفاظ ادا کئے جو الفاظ ہوتے ہوئے بھی ،نہیں ہوتے جو حلق سے نکلتے ہیں لیکن منہ یا زبان سے ادا نہیں ہوتے۔مرد صورت حال کو بگڑتا دیکھ رہا تھا۔وہ قریبی بستی کے کسی جوان کا سر کاٹ لایا تھا جو اس کے خیال میں اس کے بیٹے کا قاتل تھا۔اس نے انتقام لے لیا تھا اور اس فریضے سے سبکدوش ہو گیا تھا جو قبائلی آدم زادوں میں صدیوں سے مروّج تھا۔اس کو یقین تھا کہ اس کے بیٹے کی روح کو اپنے والد کے اس کارنامے پر فخر ہو رہا ہوگا اور وہ جہاں بھی ہوگی خوش ہو رہی ہوگی—اس نے اپنی عورت کی پہنچ سے پرے ہو کر، سر کو چمڑے کی زنبیل میں ٹھوس کر اپنی دائیں بغل سے لٹکا لیا۔میرے بدن سے بندھے ہوئے گھوڑے کو کھولا اور اس پر ایک ہی جست میں سوار ہو گیا۔اپنے جوان بیٹے کے قاتل کی گردن کاٹ کر ''ایک بار پھر جوان ہو گیا تھا۔گھوڑے کو ایک قدرے بڑے دائرے میں گھما کر وہ عورت کے قریب پہنچا اور اپنا دایاں ہاتھ اس تک بڑھایا۔گھوڑے کے حرکت میں آتے ہی وہ عورت بھی حرکت میں آ گئی۔زمین پر گری ہوئی چادر اس کے بدن پر آ چکی تھی۔جیسے ہی گھوڑا اور سواری اس کے قریب آئے وہ اوپر اٹھی اور مرد کے ہاتھ کا ہلکا سا سہارا لیا۔مرد اس دوران اس کی جانب جھک گیا تھا۔اس نے اپنا دایاں بازو عورت کی کمر کے گرد حمائل کیا جو ڈھلتی عمر کے باوجود چیتے کی کمر کی مانند پتلی تھی۔پلک جھپکتے میں وہ مرد کے آگے گھوڑے کی پیٹھ پر تھی اور گھوڑے کی گردن کے بال اس کے بدن اور چادر کو چھو رہے تھے۔سوار کے اشارے پر گھوڑا اپنے چاروں پیروں پر کچھ دیر مٹکا اور جب سوار نے اس کی ران میں ایڑھ لگائی تو وہ ایک جست لگا کر ہوا میں اڑ گیا۔

ادھر گھوڑا اور اس کے دونوں سوار منظر سے غائب ہوئے اور ادھر بستی کے لوگ جوان کے تعاقب میں تھے،اس منظر سے ہو کر گزرنے لگے۔پہلے دو سوار جنہوں نے ہوائی گولیاں بھی چلائیں پھر پیدل لاٹھیاں، بھالے اور برچھے اٹھائے، دو ایک نے ننگی تلواریں بھی لی ہوئی تھیں''دوڑو— پکڑو— جانے نہ پائیں—'' کی ہانک لگاتے ہوئے یہ سب بھی گزر گئے۔اولادِ آدم جن کے بارے میں فرشتوں نے فساد فی الارض برپا کرنے اور خون بہانے کی پیش گوئی کی تھی۔

گھنٹے،آدھے گھنٹے میں تعاقب کرنے والے واپس آ گئے۔میرے نیچے کچھ وقت ٹھہرے۔پہلے دونوں سوار آئے اور ان کے بعد پیدل۔وہ سب ناکام لوٹے تھے کیونکہ آگے بمباری ہو رہی تھی۔تعاقب کرنے والوں کو یقین ہو چلا تھا کہ بستی کے جوان کا سر کاٹ کر لے جانے والے اس شدید بمباری کی زد میں آ کر مر گئے ہوں گے۔ان کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا تھا کہ وہ کتنے آدمی تھے،جنہوں نے اس جوان کی سر کٹی لاش اپنے پیچھے چھوڑ دی۔میں بہت پہلے یہ جان چکا تھا کہ آدم زاد سوچ کے غلام ہوتے ہیں۔سوچ نے ان لوگوں کو تعاقب میں دوڑایا۔سوچ نے ان سے تعاقب ترک کرا دیا۔اس سے وہ اجتماعی سوچ کے زیر اثر تھے۔ان میں اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ میں کوئی فرق نہ تھا۔آدم زاد ہوتے تو حیوان ہیں لیکن تسلیم نہیں کرتے۔میں نے مخلوقات کی بہت ساری اقسام کو سمجھ لیا تھا۔میں نے وقت اور مقام کے طلسم سے بھی آگاہی پیدا کر لی تھی جو خلق کی تقدیر ہے۔میں اس سے بھی واقف تھا جو اس طلسم سے ماورا ہے، جو اصل ہے۔اس کے ماسوا جو ہے وہ نقل ہے۔اپنے ہونے سے میں دوسروں کے ہونے تک پہنچا تھا۔ہونے سے نہ ہونے تک پہنچا تھا۔پھر یہ ہوا کہ وقت کو سمجھنے کی کوشش میں وقت

کی مکانی حقیقت کو پا گیا یا یوں کہئے کہ حقیقت کو جو زمانی اور مکانی حقیقت ہے جب میں حقیقت لا مکانی اور لازمانی تک پہنچا تو خود پر ہنسنے کے لائق ہو گیا۔ اپنی ڈالیاں اور پتے ہلا کر — میں دانشور ہو گیا تھا۔ وہ سب جان چکا تھا جو میں جان سکتا تھا۔ جہدللبقاء سے اب میں ہراساں نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بھیانک سے بھیانک مظہر کو فطرت خلق کے عین مطابق پا کر قبول کر لیا تھا۔ عزم لِلِ قوۃ کو کبھی بھی کھلے دل سے نہیں مانا تھا۔ یوں بھی میرا ہونا پورا ہو چکا تھا۔ جتنا اونچا اٹھنا تھا، اٹھ چکا تھا۔ جتنا پھیلنا تھا، پھیل چکا تھا۔ زمین سے اوپر بھی اور زمین کے نیچے بھی۔ میری جڑیں قریبی ندی تک پہنچ چکی تھیں۔ میں نہ ہونے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔

اس روز جب کچھ لوگ آرا مشینوں کے ساتھ آئے تو میں قطعی ہراساں نہیں ہوا۔ اگر مجھے اپنے اندر اور باہر رہنے بسنے والوں کی 'بے گھری' کا دکھ نہ ہوتا تو میں دکھی بھی نہ ہوتا۔ آرا مشین والوں کی آپس کی گفتگو سے مجھے یہ پتہ چل گیا تھا کہ مجھے اور آس پاس کے چند درختوں کو اس لئے کاٹا جا رہا تھا کہ ہماری لکڑی سے ریڈ کراس کی تنظیم جنگی زخمیوں کے لئے عارضی چھپر تیار کرنے والی تھی۔

''میں اپنے نہ ہونے میں دوسروں کے ہونے کی سبیل بنوں گا'' میں نے اپنے آپ کو دلاسا دیا۔

جس وقت آرا مشین مجھے ہونے سے نہ ہونے کے مرحلے میں پہنچا رہی تھی۔ مجھے اپنے ہونے کے ایک اور رخ سے واقفیت حاصل ہوئی، جس سے واقف نہ ہو سکا تھا۔ ادھر میرا بالائی بدن کاٹا جا رہا تھا اور ادھر میرا نچلا دھڑ جو زیر زمین میں سفر کرتے ہوئے ندی کے کنارے تک جا چکا تھا۔ میرے ایک اور وجود کو ہونے کے مرحلے پر لا چکا تھا۔ یہ جان کر مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ اپنے نہ ہونے میں ہونے کا۔ میں ایک مرتبہ پھر ہونے جا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس مرتبہ میرا پرانا وجود نہیں بلکہ نیا ہی وجود ہوگا — ''تو کیا ہوا —؟ میں ہو تو رہا تھا — پرانا نہ سہی، نیا ہی سہی — '' میں نے سوچا۔

......دسواں مکان......

میں صدر کے ایک سستے پب جس کے باہر ڈسپنسری (DISPENSARY) کا بورڈ لگا ہے، کوئٹہ ساختہ وہسکی کے چوتھے اور اپنے آخری پیگ کے ساتھ انصاف کر رہا تھا۔ میرے اس شام کے رفیق مے نوشی ایم۔ اے۔ بیگ (مظہر انوار بیگ) کو پہلے ہی پیگ میں چڑھ گئی۔ اس نے دوسرے پیگ کو ہاتھ میں پکڑ کر اس سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ ایم۔ اے۔ بیگ خاصا پکا پکایا بندہ تھا۔ اس کا ایک پیگ میں ڈھیر ہو جانا میرے ذہن کے نیچے نہیں اترا۔ یوں بھی وہ ایک فری لانس جرنلسٹ ہے۔ یہ فری لانس جرنلسٹ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکے ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا رات تو اپنی ہے اس بندے کے ساتھ ہی صحیح۔ میں نے کہا ''مسٹر بیگ آؤ باہر چلتے ہیں اور گورنر ہاؤس کے فوارے کے سامنے والے لان میں گپیں لگاتے ہیں'' اس نے جواب میں نہ تو ہاں کہا اور نہ ہی نا۔ البتہ کھڑا ہو گیا اور کھڑے ہوتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا ہوا پیگ حلق میں انڈیل لیا۔ ہم دونوں باہر نکل آئے اور بوہری بازار کی تنگ لیکن بارونق اور آباد گلیوں سے ہوتے ہوئے ریکس سینما کے سامنے جا نکلے اس کے آگے چلے تو بیگ کے قدم اس میخانے کی جانب آپ ہی آپ بڑھنے لگے جس کے صحن میں ایک لمبا سا تاڑ کا پیڑ ہے۔ میں نے اس کے کندھے کے اسٹیرنگ کو سیدھے راستے کی طرف گھما دیا۔ چند ہی منٹ میں ہم دونوں لان کے ایک گوشے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

کراچی شہر کی ایک خوبصورت رات آسمان سے اتر کر چاروں اور پھیل چکی تھی۔ بہت جلد آسمان سے اتری ہوئی اس رات کی مدد سے میں نے بیگ کو باتوں کی پٹری پر دوبارہ لا ڈالا۔ اس دوران چاٹ والا ہمیں دو پلیٹ خشک چاٹ دے گیا جس کا ہم نے لان کے باہر آرڈر دے دیا تھا۔ یہ چاٹ ہم جیسے بار سے آئے ہوئے لوگوں کے لئے تیار کی جاتی تھی۔ بیگ نے اس چاٹ کی ایک پھنکی منہ کے حوالے کر کے باتیں شروع کر دیں۔

''میں قصبہ کالونی میں اس رات جو کچھ ہوا، اس کو ایک بار پھر واقع ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اڑتی چڑیا نے یہ خبر بہم پہنچائی تھی کہ اس روز قصبہ کالونی میں کچھ ہونے والا ہے ایک لسانی تنظیم کے لڑکوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ دوسری لسانی شناخت رکھنے والوں کی ایک چھوٹی سی بستی میں صفایا کر دیا جائے جو بمشکل پچاس ساٹھ گھروں پر مشتمل تھی۔''

''ارے یہ تم نے کیا قصہ چھیڑ دیا۔ ختم کرو۔ تم نے یہ اطلاع قصبہ پولیس کو پہنچا دی اور ایک خونی واردات کو واقع ہونے سے روک دیا۔ اور تمہیں تھانہ انچارج نے سند امتیاز دلوا دی۔'' میں بیزاری سے بولا۔

بیگ نے مجھ پر عجیب سی نظر ڈالی جیسے وہ میری بات پر دھیان دینا ہی نہ چاہتا ہو۔ اس کی آواز میں بھی کچھ ایسا تھا جس نے مجھے چپ کر

دیا۔

’’میں پولیس تھانے نہیں گیا۔ مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ پولیس میں جاتا تو تھانے ہی میں روک لیا جاتا۔ میں نے کسی بڑے اخبار کے دفتر کو بھی اطلاع نہیں دی اور نہ کسی ٹی وی چینل والوں سے رابطہ کیا۔ میں جانتا تھا کہ میں اس ہونی کو روکنے میں ناکام رہتا۔ میرے لئے ایک ہی راستہ تھا، اس کو ہوتے دیکھوں اور ممکن ہو تو اس کو اپنے کیمرے میں محفوظ کرلوں، ۔ سو میں نے اس خونی معاملے کے شروع ہونے سے کافی دیر پہلے اپنے آپ کو وہاں جما لیا اور ایک ڈرم کے اندر بیٹھ کر مورچہ بنایا۔ وہ ڈرم میرے لئے کافی تکلیف دہ تھا۔ لیکن میں اس کے اندر سے ایک وسیع علاقے کو ’’کور‘‘ کرنے کی صلاحیت کا مالک ہو گیا۔ جس جگہ وہ ڈرم رکھا تھا، وہ اس علاقے کا تاریک ترین گوشہ تھا۔ مجھے مکمل تنہائی حاصل تھی۔ جب وہ خونی معاملہ شروع ہوا تو حملہ آوروں نے اطمینان سے تیاری کی سب سے پہلے تو اس آبادی کے اطراف کلاشنکوف بردار لوگوں کے پہرے لگے۔ اس کے بعد بڑے اطمینان سے اس آبادی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہتھیار بند آدمی گھروں میں گھسنے لگے اور اپنا خونی کام انجام دے کر باہر آنے لگے۔ میں موقع موقع سے کیمرے کو باہر نکال کر اور حرکت دے کر اس منظر کو فلم بند کرنے میں لگ گیا۔ ظاہر ہے میں اس پوری بستی کو جو آگ اور خون کے آغوش میں آئی ہوئی تھی۔ اپنے کیمرے میں نہیں اتار سکتا تھا۔ میرے اور میرے کیمرے کی آنکھوں کے سامنے دس مکانات تھے۔ اور ان میں اپنا لسانی اور قومی فرض بھگتانے والے وحشی تھے۔ ان وحشیوں میں ایک وہ بھی تھا جس کی لمبی ریش اس کی ناف تک جاتی تھی اور جس کے ہاتھ میں تسبیح تھی، جس کے دانے اس کی انگلیوں کی زد میں تھے۔ اس کے بائیں ہاتھ میں مشعل سی فروزاں تھی۔ وہ واردات میں حصہ لینے والوں کے ساتھ مکانوں میں یکے بعد دیگرے داخل ہوتا اور ان کو نذرِ آتش کر کے نکلتا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ جب اس کے ساتھی مکان کے اندر رہنے والوں کو تہہ تیغ کریں تو وہ ان کو اور مکان کو جلا کر اپنا فرض منصبی ادا کرے۔ میرا مووی کیمرہ حرکت میں تھا اور نیم روشن، نیم تاریک، اس علاقے میں ہونے والی اس بھیانک غیر انسانی واردات کو اپنی آنکھوں میں محفوظ کر رہا تھا میرے کیمرے کی آنکھ کی حد جس مکان سے شروع ہوتی تھی وہ مکانات کی اس قطار کا دسواں مکان تھا۔ ان دس مکانات کے عقب ایک انسانی آبادی تھی۔ جو غیر آبادکی جا رہی تھی۔ دسواں مکان قدرے تاریکی میں تھا اور اس تاریکی کو ایک گھنا پیڑ بھی تاریک تر بنا رہا تھا۔ اس پیڑ کے عین سامنے کچھ فاصلے پر کوڑے کرکٹ کے ایک ڈھیر کے ساتھ ہی میں اپنی پناہ گاہ وسیع وعریض میں ڈرم میں بیٹھا کیمرہ گھما رہا تھا۔ بہت جلد میں نے یہ غیر معمولی بات نوٹ کی کہ اس گھنے پیڑ کے نیچے والے مکان میں جس پر سرخ رنگ سے انگریزی میں ’10‘ پینٹ کیا ہوا تھا داخل ہونے والا باہر نہیں نکلا تھا۔ میرے ایسا محسوس کرنے کے بعد بھی یکے بعد دیگرے دو تیغ بدست اندر گئے اور وہیں کے ہو رہے ان کے بعد وہ لمبی ریش والا تسبیح کے دانے چلاتا ہوا اندر داخل ہوا اور فوراً بعد ہی باہر آیا چیختا، چلاتا لیکن دروازے کی چوکھٹ پر دھڑام سے گر پڑا۔ وہ اپنے لہو میں نہا رہا تھا۔ اس کا بدن کچھ دیر تک پھڑک کر ساکت ہو گیا۔ مشعل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کوڑے کے ڈھیر میں آ گری۔ اسی لمحہ اس مکان سے ایک عورت برآمد ہوئی اور دوڑتی ہوئی میرے ڈرم کی طرف آئی۔ اس دوران میں ڈرم سے باہر کود چکا تھا کیونکہ کوڑے کے ڈھیر نے آگ پکڑ لی تھی۔ ادھر میں باہر کودا ادھر وہ عورت میرے ہاتھوں کی زد میں آئی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ اسی ہاتھ میں اس نے تلوار تھامی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

''تلوار پھینکو اور میرے ساتھ بھاگو۔''

اس نے حالات کا تقاضا سمجھ کر میری بات مان لی۔ البتہ تلوار بہت دیر بعد پھینکی۔ میری قسمت یاور تھی ــــ میں عورت کو، کیمرے کو اور اپنے آپکو اس موٹر بائک تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا جس کو میں نے دور ایک جھاڑی میں چھپایا تھا۔ اتنا کہہ کر ایم اے بیگ فری لانس جرنلسٹ ایک دم چپ ہو گیا اور اس لڑکے کو پلیٹیں واپس کرنے میں لگ گیا۔ ادائیگی پہلے ہی کی جا چکی تھی۔ لیکن لڑکا ان پلیٹوں کو دیکھ کر آنکھیں چمکانے لگا۔ جو قریب قریب بھری ہوئی تھیں ــــ ہم دونوں نے تمام دوران اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ لڑکے کے جانے کے بعد دوبارہ طاری ہونے والے سکوت کو توڑتے ہوئے میں نے بیگ سے کہا:

''اس مووی فلم پر تو تمہیں خاصی رقم ملی ہو گی۔ کس کو فروخت کی تھی''

''کسی کو بھی نہیں۔''

''کیوں؟''

''بس دل نہیں چاہا، بیچتا تو قصائیوں کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ لیتا ــــ
اس لئے ــــ''

''خوب ــــ!'' میں نے اسے حیرانی اور قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے مجھ سے آنکھیں نہیں ملائیں۔ اور آسمان کو دیکھنے لگا۔ آسمان اودے سے سیاہ ہو چکا تھا اور جگہ جگہ تاروں کے نقاط روشن ہو گئے تھے ''اس عورت کا کیا ہوا'' میں نے اس کو آسمان سے زمین پر اتارنے کے لئے سوال کیا۔

''اس کا اپنا کوئی بھی زندہ نہ بچا تھا۔ رہا شوہر تو شوہر کے قاتل کی تلوار چھین کر ہی تو وہ عورت سے شیرنی بنی تھی۔ اس شیرنی سے کچھ عرصے بعد میں نے شادی کر لی''۔ بیگ نے آسمان کی بلندی سے میرے سوال کا جواب دیا۔

☆☆☆

......میری بیوی......

میری بیوی نہ تو اتنی خوبصورت تھی کہ اس کے حسن کے چرچے عام ہوتے اور نہ ہی اتنی بدصورت کہ دیکھنے والا اس پر دوسری یا تیسری نظر نہ ڈالے، البتہ اس کے جسم میں کچھ تھا مائل کرنے اور پکڑنے والا۔ میں اپنی بیوی سے بالکل مطمئن تھا اور شاید وہ بھی مجھ سے مطمئن تھی۔ سب سے بڑی بات دنیا ہم سے مطمئن تھی اور ہم دنیا سے مطمئن تھے۔ ہمارے گھر میں ہم دونوں کے علاوہ ایک کتّا تھا جو باہر سے بدصورت اور اندر سے بے حد خوبصورت تھا، ڈھیر سارے چھوٹی ذات کے طوطے تھے اور ایک سفید چوہا۔ میری بیوی ان کے ساتھ گھل مل کر رہتی اور ان کی دیکھ بھال کرتی۔ وہ پڑوسیوں کے ساتھ بھی مل جل کر رہتی۔ رشتے داروں کا آنا جانا نہیں تھا۔ میرے سب لوگ میلوں دور اور اس کے لوگ سمندروں دور رہتے تھے۔ شادی کے بعد دو سال ایسے گزرے جیسے ویک اینڈ گزر جاتا ہے۔ پھر یہ ہوا کہ میرا تبادلہ امورِ خارجہ کے اس شعبہ میں ہو گیا جو میرے ملک کے عالمی منصوبوں پر کام کرتا ہے اور جلد ہی مجھ کو ایک خاص مشن پر دور دراز کی ایک چھوٹی ریاست میں بھیج دیا گیا۔ وہاں کا ماحول سازگار نہ تھا یوں انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی لیکن باہر والوں کو چوکنّا رہنا پڑتا تھا۔ وہاں زیرِ زمین ایسی تنظیمیں موجود تھیں جو باہر والوں کی ''ٹارگٹ کلنگ'' میں مشہور تھیں اس کے علاوہ بیرونی ملکوں کے ایجنٹ بھی موقع ملتے ہی کام کر جاتے۔ مقامی لوگ تو فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے ایک دوسرے کو مارنے کاٹنے میں مصروف رہتے تھے۔ میرے ملک والے ہی نہیں دوسری بڑی طاقتوں کے ایجنٹ مقامیوں کو تقسیم کرنے اور لڑانے میں لگے ہوئے تھے۔ ان کے مقاصد مختلف ہو سکتے تھے لیکن ان سب کا طریقۂ کار مشترک اور ایک جیسا تھا۔ میں یہاں آیا تو پتہ چلا کہ یہاں فرائضِ منصبی ادا کرنے کے اوقات صحیح معنوں میں کل وقتی تھے یعنی دن اور رات کے چوبیس گھنٹے۔ ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلا کہ گھر جانا کوئی آسان نہیں۔ فون کالس پر بھی پابندی تھی۔ ای میل پر بات کرنا بھی متعیّنہ حدود کے اندر ممکن تھا ورنہ درمیان سے سینسر ہو جاتا۔ حدود سے میری مراد موضوعات کے حدود۔ سچ تو یہ ہے کہ گفتگو ہائی، ہیلو، ہوَ آر یو، فائن، تھینک یو، آئی لو یو، لو یو ٹو، او کے، ٹیک کیئر تک ہی محدود ہوتی۔ محکمہ جاتی مراسلت، پرنٹڈ میٹر، کی شکل اور خاص معاملات ''کوڈ'' میں بھیجے جاتے۔ جیسے ہی میں وہاں پہنچا مجھے بہت سارے معاملات پر بریف کر دیا گیا۔ ہر روز کے انسٹرکشن ایک مخصوص طریقۂ کار کے تحت روز روز مل جاتے، انٹرنیٹ پر بھی بہت کچھ لیا اور دیا جاتا۔ یوں تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا لیکن بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں اپنی بیوی سے قریب قریب جدا ہو گیا تھا۔ یہ جدائی مجھے بے حد شاق گزرتی۔۔ وہ بھی میری جدائی میں بہت بور ہوتی ہوگی۔۔ اتنے عرصے کے ساتھ میں یہ حقیقت مجھ پر آشکار ہو چکی تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے لئے بنے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر ہی زندگی گزار سکتے تھے'' ہوَ سوئیٹ اینڈ ہوَ اورینٹل'' (کتنا پیارا اور کتنا مشرقی) میں نے اپنی اس سوچ کی آپ ہی تضحیک کی۔ یوں تو میں گھر جانے کے لئے پہلے ہی ہفتے سے جُگاڑ نکالنے میں لگا تھا لیکن کامیابی تیسرے مہینے کے اواخر میں نصیب ہوئی۔ شاید یہ کامیابی بھی اس لئے ممکن ہوئی تھی کہ ہم لوگوں نے کم وقت

میں مطلوبہ نتائج حاصل کر لئے تھے۔جن دو بڑے مذہبی گروہوں میں منافرت کے بیج ہم نے بوئے تھے وہ اب قد آور درختوں کی صورت اختیار کر کے پھل دینے لگے تھے۔دونوں گروہوں کے اربابِ اختیار میں سے بیشتر نہیں چاہتے تھے کہ آپس کے اختلافات کو ہوا دی جائے ۔اس سبب سے ہمارا کام قدرے مشکل ہو گیا تھا۔چار و نا چار ہمیں ایسے اقدامات کی جانب رجوع ہونا پڑا جو خود ہمارے لئے بھی خطرے سے خالی نہیں تھے۔ ہر صورت میں ہمیں پردے میں رہنا تھا۔بہر حال ایک سے زائد مرتبہ کبھی اِس گروہ اور کبھی اُس گروہ کے لوگوں کو دورانِ عبادت قتل کروانا پڑتا،تا آنکہ ان کا پیمانۂ صبر چھلک پڑااور وہ ایک دوسرے کا خون بہانے پر مجبور ہو گئے۔یہی ہمارا سب سے بڑا مشن تھا اور اس مشن میں ہم کامیاب ہو گئے تھے۔اسی دوران ہمیں اپنی ایمبیسی کے چند مقامی ملازموں کو بھی مروانا پڑا۔افسوس کہ مقامیوں کے علاوہ ہمارا ایک آدمی بھی زد میں آ گیا۔اس طرح کے واقعات تو ہمارے پیشے کے معمولات میں داخل ہوتے ہیں۔کہاں ہماری ایک جان اور کہاں مقامیوں کی ہزار جانیں۔۔دونوں میں کوئی تناسب نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ریاست کے دونوں بڑے گروہ ایک دوسرے کے ساتھ بر سرِ پیکار تھے۔آئے دن فسادات رونما ہونے لگے تھے،لا اینڈ آرڈر کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔قانون کی حکمرانی اور حکومت کے رِٹ کے تصوّر کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔اسٹاک ایکسچینج کا انڈکس روز بروز گرتا جا رہا تھا۔باہر کے لوگوں نے جو پیسہ ریاست کی صنعت و تجارت میں لگایا تھا اسے تیزی سے نکال رہے تھے۔مقامی انویسٹرز کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔حکومت بیرونی قرضوں کے جال میں پھنستی جا رہی تھی۔بیرونی طاقتیں امداد کے نام پر غلامی کے طوق پہنانے میں مصروف ہو گئی تھیں۔پڑوسی ملک ریاست کی سرحدوں پر اپنی رال ٹپکا رہے تھے،غرّا رہے تھے،دھمکیاں دے رہے تھے جس کے نتیجے میں ریاست کے وسائل، بیرونی قرضوں،اور امداد کا بڑا حصّہ ہتھیاروں کی خریداری اور دفاعی سامان کی فراہمی میں صرف کیا جا رہا تھا۔ایک کمزور، زوال پذیر ملک بہت جلد ہماری گود میں گرنے کے لئے تیّار ہو رہا تھا۔بہت جلد وہ بظاہر آزاد اور بباطن ہمارا غلام ملک ہونے جا رہا تھا۔ہمارا محکمۂ فوج اس ملک میں اپنا فوجی اڈّہ بنانے کی تیّاریاں پہلے ہی مکمل کر چکا تھا۔جس دن میں اپنے گھر کے لئے پرواز کرنے والا تھا مجھے یہ احکامات وصول ہوئے کہ میری چھٹّی منسوخ کی جا چکی تھی اور اب مجھے سرکاری کام سے جانا تھا۔اس کام کی مدّت ایک ہفتہ تھی۔البتہ مجھے اجازت دی گئی تھی کہ میں اپنے گھر رہ سکتا تھا۔یہ صورتِ حال میرے لئے خلافِ توقع حد تک بہتر اور قابلِ قبول تھی شاید ایسی ہی صورتِ حال کو'ایک پنتھ دو کاج' کہا جاتا ہے۔میں خوش تھا،اور کیوں نہ خوش ہوتا آخر گھر جا رہا تھا۔۔گھر، جہاں میری بیوی رہتی تھی۔میں یہ محسوس کر کے بے حد حیران تھا کہ میری خوشی میں کوئی اڑچن سی تھی۔ایسا لگتا تھا جیسے میں خوش ہوں بھی اور نہیں بھی۔''یہ سب کیا ہے؟''میں یہ سب سوچنے پر مجبور تھا۔بیوی سے اتنا عرصہ جدا رہنا میرے لئے کیسا تجربہ تھا یہ میں خوب جانتا تھا۔میرے سوا اور کون جان سکتا تھا؟ شاید یہ بھی پورا سچ نہیں تھا۔پورا سچ تو یہ تھا کہ میرے چہرے مہرے،طور واطوار سے یہ پتہ چل گیا تھا کہ میں ان شوہروں میں سے تھا جن کو' ہین پیکیڈ' کہا جاتا ہے۔سب کو نہیں تو میرے ایک افسرِ بالا اور ایک رفیقِ کار کو ضرور اس کا اندازہ تھا۔اس کا پتہ مجھے اس طرح چلا کہ جب میرے افسرِ بالا نے ایک پارٹی میں مجھے اس کارنر میں بیٹھے دیکھا جہاں وہ لوگ بیٹھتے ہیں جن کو ڈانس کرنا نہیں آتا یا جو کسی نہ کسی سبب سے ڈانس کرنے سے گریزاں ہوتے ہیں۔اس نے مجھے دیکھا،مسکرایا اور آنکھ دبا کر بولا ''انجوائے دی پارٹی اولڈ مین'' آخر پارٹی میں مسز زی کا کوئی مصرف ہونا چاہئے۔اور ہاں مس ایکس تو تمہیں ہڑپ کرنے کے لئے بالکل

تیّار رہے۔ اگر تم اسکو مگر مچھ بن کر نگل بھی جاؤ تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور نہ ہی محکمے کو ہوسکتا ہے" میں بھی جواب میں مسکرایا لیکن اس جگہ سے اس وقت تک نہیں ہلا جب تک ڈانس کی موسیقی بند نہیں ہوئی ۔ میں نے ڈانس کے دوران مسز زی اور مس ایکس پر اچٹتی نظر ڈالی وہ دونوں ڈانس کرتے ہوئے مردوں پر اس طرح گر رہی تھیں جیسے تتلیاں پھولوں پر گرتی ہیں۔ اس کے دوسرے دن کافی بریک کے دوران اسنے مجھے تنہا بیٹھا دیکھ کر صرف اتنا کہا" بیوی یاد آرہی ہے۔۔ ہے نا" اور ہنستا ہوا ایک لمبی ٹانگوں والی لڑکی کے ساتھ کافی لاونج سے باہر نکل گیا۔ کسی ایسے ہی موقع پر ایک کولیگ نے بھی میرے ساتھ ایسا ہی رویّہ اپنایا۔ ایک ہر دلعزیز دیالو مقامی لڑکی جس سے میل جول کا اوپر سے او کے سگنل ملا ہوا تھا خود میری طرف آئی اور مجھے اپنے گھر لے جانے پر اصرار کرنے لگی لیکن میں پس و پیش کرنے لگا۔۔۔۔۔۔ میرے اس کولیگ نے دور ہی سے صورتِ حال کو بھانپ لیا اور میری کلائی پر بندھی گھڑی جیسی شکل کے فون پر مجھے پیغام دیا" اے بیوی کے وفادار احمق اگر تو نے اس خوبصورت کتیا کو ٹھکرایا تو میں تجھے مار ڈالونگا" یہ بتانا ضروری نہیں کہ میں اس خوبصورت نوجوان کتیا کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا۔ اس کا گھر جو ایک بوڑھی آنٹ کی موجودگی کے باوجود ہم جیسے دور افتادہ جوان آدمیوں کے لئے جنّت سے کم نہ تھا۔۔۔۔ یہ اور بات جب ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے کے مزے لوٹ رہے تھے گھر کے ایک کونے میں رکھے ہوئے ٹی وی اسکرین پر مقامی لوگوں کے ہاتھوں مارے گئے مقامی لوگوں کی لاشیں ایک عبادت خانے کے اندر جگہ جگہ خون سے لت پت دکھائی جا رہی تھیں۔ عجیب لوگ تھے کہ بچّوں، جوانوں، اور بوڑھوں، کی لاشوں کا انتہائی قصابانہ انداز سے بار بار نظارہ دکھا رہے تھے، کیف و مستی میں پوری طرح غرق ہو جانے کے باوجود میں اس منظر سے بدمزہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور واش روم جا کر الٹی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ اور بات کہ میں نے اپنے احساسات اس مقامی حسینہ پر ظاہر نہیں ہونے دیئے ورنہ وہ ضرور حیران رو جاتی کہ اتنے بڑی عالمی طاقت کا ایک سپوت اتنا جذباتی اور نرم دل۔" کیا میں واقعی نرم دل ہوں۔۔۔ ہیومینٹرین۔۔۔ ٹو ہیل وداٹ۔۔۔ شٹ" میں اندر ہی اندر اپنے آپ پر غصّہ ہوا اور اپنے اندر کے وُلف (بھیڑیئے) کو باہر نکال کر اس مقامی لیکن جان لیوا بھیڑ پر ٹوٹ پڑا اگر میں ایسا نہ بھی کرتا تو بھی وہ میرا والٹ ضرور ہلکا کرتی۔

بیوی سے میری ملاقات ایئر پورٹ پر ہوئی، وہ مجھے ایئر پورٹ پر لینے آئی تھی، معمول سے کہیں زیادہ پُر کشش لیکن قدرے مختلف اس نے بالوں کو بالکل ہی مختلف انداز سے بنایا ہوا تھا جسکی وجہ سے اسکا چہرہ بدل سا گیا تھا، گردن اور زیادہ پتلی ہو گئی تھی۔ اس کا لباس بے حد مختصر تھا۔ اٹھنگی سی شرٹ اور چھوٹی سی چڈّی وہ بھی بھڑکیلے لال رنگ کی۔ وہ سر سے پیر تک دعوت ہی دعوت تھی۔ میں نے اس سے قبل اپنی بیوی کو کسی پبلک پلیس پر ایسے لباس اور ایسے انداز میں نہیں دیکھا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ چلتے ہوئے ایئر پورٹ کے پارکنگ کمپلیکس کی بھول بھلیّوں میں بھٹک رہے تھے۔ میرے جن ہاتھوں کو بیوی کی پتلی کمر کے گرد حلقہ بنانا تھا وہ ہینڈ کیری گھسیٹ رہے تھے۔ اس کے لازمی نتیجے کے طور پر میری بیوی نے اپنے ایک بازو سے میری کمر کو اور کولھوں کو تھاما ہوا تھا۔ ایئر پورٹ سے گھر جانے کے دوران میں نے اپنی بیوی کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ اس مختصر لباس میں گاڑی چلاتے ہوئے ہو بالکل برہنہ لگتی اگر اس کے کپڑوں کا رنگ بھڑکیلا نہ ہوتا۔ جب میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا تو اسکی آنکھوں کے نیچے سیاہی مائل بھورے حلقے نظر آئے۔۔" کیا وہ بیمار تھی۔۔؟ کیا وہ دیر

دیر تک جاگتی رہتی تھی۔۔؟ کیا اس نے میری جدائی کو اپنے اندر لے لیا تھا۔۔؟ کیا وہ زیادہ پینے لگی تھی۔۔؟'' ایئر پورٹ سے گھر بہت زیادہ دور نہ تھا۔ جب ہماری گاڑی گھر کے گیراج میں داخل وہ رہی تھی۔ میں نے اس کے گال پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے بڑے پیار سے پوچھا۔'' کیا تم زیادہ پینے لگی ہو۔۔'' میرے اس سوال پر وہ چونکی اور بولی۔''تمہیں کیسے معلوم ہوا۔۔؟ ہم دونوں گاڑی سے اترے، اترتے ہی وہ تیزی سے میری طرف آئی اور مجھ سے لپٹ ہی نہیں بلکہ چمٹ کر سسکیاں لینے لگی، گیراج کا شٹر اوپر ہی تھا، میں نے اسکے ہاتھ سے ریموٹ لیا اور شٹر گرا دیا۔ میں اسکو لپٹائے، لپٹائے چھوٹا سا چوبی زینہ چڑھ کر اور اسکو اپنے سہارے چڑھا کر گھر میں داخل ہو گیا۔ گھر کے اندر پہونچتے ہی وہ آواز سے رونے لگی، میرے گلے میں اپنی باہیں حمائل کئے، میرے چوڑے سینے سے اپنا گداز سینہ چپکائے وہ رو رہی تھی کبھی آواز سے اور کبھی بے آواز۔۔ آخر میں نے اس کو انتہائی رسان سے، نرمی سے اپنے بدن سے جدا کیا۔۔ اسکے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور اسکے روتے پھڑکتے منہ اور ہونٹوں کو اپنے منہ اور ہونٹوں سے بند کیا، ایک خاموش طویل بوسے کی صورت میں جو ہم دونوں کے جسموں سے ہو کر روحوں میں اتر گیا اور دیر تک اترا رہا۔ جب میں نے اسکے منہ کو آزاد کیا تو اس نے اپنا سر جھکا لیا اور سرگوشی کی جیسے کسی گناہ کا اعتراف کر رہی ہو۔۔''یس ڈارلنگ۔۔ تمہاری پیاری بیوی ایک ڈرنکرڈ۔۔ ایک بلڈی ڈرنکرڈ ہو گئی ہے۔!!'' میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔اس قسم کے پروفشلزم کی ہمیں تربیت دی جاتی ہے۔ ورنہ سچ پوچھئے تو اپنی بیوی کی حالت اور اس اعتراف سے میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اس سے قبل وہ بیئر بھی کم کم پیتی تھی۔ شیمپیئن کی بھی صرف چند چسکیاں۔ وہسکی کے جام تو وہ لبوں سے چھونے سے بھی گریز کرتی۔ میں نے تاسّف، تردّد اور تفکّر کے سارے مرحلے اس ایک لمحے میں، ایک ہی ساتھ طے کر لئے تھے۔ ساتھ ہی اپنے آپکو خوف زدہ بھی محسوس کر رہا تھا، یہ سب میرا اندر تھا۔ اپنے باہر جو میں نے ردِّعمل ظاہر کیا وہ یہ تھا کہ میں نے اس کے ہونٹوں پر دو انگلیاں ثبت کیں پھر آہستہ سے کہا ''اس موضوع پر کسی اور وقت بات کریں گے''۔

گھر جا کر، بیوی سے ملاقات کر کے میں نے صورتِ حال کی مضحکہ خیزی کا خوب خوب عرفان کر لیا تھا۔ محکمے نے مجھے چھٹّی پر نہیں بلکہ ڈیوٹی پر روانہ کیا تھا۔ یہاں تک کہ میرا گھر جانا اور اپنی بیوی سے ملنا بھی ایک ڈیوٹی جیسا لگ رہا تھا۔۔۔ ڈیوٹی سے بھی زیادہ سنجیدہ اور گھمبیر۔۔۔ میری حالتِ زار کا اندازہ صرف وہی انسان لگا سکتا تھا جسکا واسطہ کسی عادی شرابی سے پڑا ہو اور وہ بھی شرابن بیوی سے۔ ایک جانب میں اس کام میں جٹا ہوا تھا جو میرے سپرد کیا گیا تھا تو دوسری جانب میں اپنی بیوی کو زیادہ سے زیادہ وقت دینے کی کوشش میں لگا تھا۔ میں چاہتا تھا دونوں محاذوں پر کامیاب ہو جاؤں۔ سرکاری کام قدرے آسان ثابت ہو رہا تھا لیکن غیر سرکاری کام جس کا تعلق میری اپنی بیوی سے تھا میرے لئے ''نا قابلِ حصول ٹارگٹ'' بنتا جا رہا تھا۔ سرکاری کام ڈکیومینٹیشن کی نوعیت کا تھا۔ انفارمیشن کو ڈس انفارمیشن میں بدلنے کا اور ڈس انفارمیشن کو مصدّقہ (اتھینٹک) بنانے کا۔ ایک ہفتے کے کام کو صرف دو دن میں نمٹا چکا تھا۔ اب میری پوری توجّہ اپنی بیوی پر تھی۔ میں یہ نہیں کہ سکتا کہ اس نے شراب ترک کر دی تھی البتہ یہ کہ سکتا ہوں کہ میری خاطر وہ ٹُن ہونے سے بچنے لگی تھی۔ دن میں 'جوب' کے دوران پینے سے یوں بھی بچتی ہوگی۔ میری خاطر 'جوب' سے چھٹّی کرنے کے باوجود وہ شراب کو ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔ لیکن میرے گھر سے باہر جاتے ہی وہ ایک دو گھونٹ حلق سے نیچے اتار لیتی۔ میں اسکی پسند اور اسکے طریقۂ کار سے واقف ہو چکا تھا۔ زیادہ تر وہ ''ووڈکا'' سے شوق کرتی لیکن

موقعہ ملتا تو ''جن'' میں سنگتروں کا رس آمیز کر کے چڑھاتی۔ وہسکی کے لئے وہ ہمہ وقت تیّار رہتی اور اسکے ساتھ سیب کا رس پی کر تو وہ خود شراب بن جاتی۔ شام کا آنا تو غضب ہو جاتا۔ شام۔۔۔ اور شام کے بعد وہ بڑی مشکل میں پڑ جاتی۔ پہلے وہ مجھ سے چھپ کر واش روم میں پیتی لیکن بہت جلد چھپنے چھپانے کے تکلّف سے آزاد ہو جاتی۔ میں حتی الامکان اس کا ہاتھ روکتا لیکن اس کو روکنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا تا۔ اس کو پکڑنا اس لئے مشکل ہوتا کہ وہ ہر قسم کے برتن میں ڈال کر رکھ لیتی تا کہ نظر میں آئے بغیر' پی سکے' عام گلاس، ڈسپوزایبل گلاس، کوئی سابوَل (پیالہ)، چھوٹا، بڑا، سوپ نوشی کا، یا جوس پینے کے مقصد کا کوئی سا کپ، یا مگ ۔۔۔۔ گھر کے اندر وائن بوَل میں وہ عام طور پر پانی پیتی تھی۔ پانی پینے کا تو یونہی ذکر آ گیا۔ شراب کی زیادتی نے اس کے جگر پر اثر کرنا شروع کر دیا تھا وہ پانی پینے اور پانی ھضم کرنے کے لائق نہیں رہی تھی ۔۔۔ شراب کی عادت نے، میری جدائی نے، نئے لوگوں کی صحبت نے، اس میں کچھ بدلاؤ بھی کر دیا تھا۔۔ اس کا پہلا تجربہ یوں ہوا کہ ایک شام جب میں واش روم میں نہانے گھسا تو وہ بھی میرے ساتھ لگی چلی آئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی شاور باتھ میں لے گئی میں ننگ دھڑنگ اس کے پیچھے گھسٹتا چلا گیا، میں شاور کے نیچے کھڑا تھا اور وہ شیشے کی دیوار کی دوسری جانب کھڑی مجھے دیکھتی رہی تھوڑی دیر وہ مجھے دیکھ کر ہنستی رہی پھر نجانے کہاں سے اس کے ہاتھ میں ایک گلاس آ گیا۔ جس میں میرے اندازے کے مطابق چار پیگ تھے۔ کھڑے کھڑے اس نے ایک ہی سانس میں ساری کی ساری شراب حلق سے نیچے اتار لی اور خالی گلاس قریب ہی کہیں رکھ کر جب وہ نمودار ہوئی تو اس کے گلے میں لٹکے ہوئے ایک تَھے سے کر اس کے علاوہ تن ڈھانپنے کے لئے اور کچھ نہ تھا۔ ''تمہیں تو شاور کے نیچے نہانا بھی نہیں آتا'' اس نے گھٹی گھٹی ہنسی میں ملی جلی آواز سے کہا۔ پھر اس نے مجھے شاور کے نیچے نہانے کا درس دینا شروع کیا۔ تھوڑی دیر کے لئے میں یہ بھی بھول گیا کہ میری بیوی ایک ''شرابن'' تھی جس کو مجھے ایک نارمل عورت بنانا تھا۔ اس وقت وہ صرف ایک عورت تھی۔۔۔

اس عورت نے مجھے شاور کے نیچے نہانے کا جو درس دیا تھا کس سے سیکھا تھا۔۔۔؟ میری بیوی تو یہ سب کچھ نہیں جانتی تھی۔۔۔ کیا یہ عورت ''میری بیوی نہیں ہے۔۔۔؟'' کیا یہ کوئی اور عورت ہے۔۔۔؟ کیا ''میری بیوی'' بدل گئی ہے۔۔۔؟ کسی اور عورت نے میری بیوی کی جگہ لے لی ہے۔۔۔؟ اگر یہ ''میری بیوی'' نہیں ہے تو یہ شرابن میرے گھر میں کیا کر رہی ہے۔۔۔؟

شاور کے نیچے نہانے کے بعد پہلی تنہائی میسّر آنے پر میں نے اپنے آپ کو ان جیسے بے شمار سوالوں میں گھرا ہوا پایا۔

جس پہلی تنہائی کا ذکر میں نے کیا ہے وہ میں نے کس طرح گذاری اس کا ذکر آپ کے لئے باعثِ تعجب ہوگا۔ وہ کسی طرح بھی تنہائی کہلا نے کی مستحق نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ایک ڈسکو کلب تھا، مجمع، شور، رقص، گہما گہمی، لپٹا لپٹی، خوشبو، رنگ، رنگ برنگی روشنیوں کی مار، ہر سائز، ہر وضع، ہر عمر، ہر قماش کی عورتیں اور مرد۔ ٹین ایجرز سے لے کر پختہ جوان مرد، ادھیڑ، بوڑھے، سینیئرس، ساٹھے پاٹھے، سترے بہترے، ایک دو ان سے بھی گئے گزرے، ایک دو معذور، ایک وہیل چیئر والا، دو ایک مصنوعی بازو، مصنوعی ٹانگ والے ریٹائرڈ فوجی جن میں بیشتر کسی نہ کسی جسمانی نقص کو اپنی فوج کی سوغات کے طور پر پیش کرنے کے شوقین! ڈاڑھی والے، کلین شیو، صرف مونچھوں والے، گنجے مرد، گنجی عورتیں، وِگ پوش مرد، وِگ پوش عورتیں، بلونڈ بالوں والی عورتیں، بر ینٹ بالوں والی عورتیں، سرخ سر والے مرد اور عورتیں، گورے لوگ، کالے لوگ، بھورے لوگ، زرد لوگ، لمبے، ٹھگنے، موٹے، دبلے لوگ، شریف، بدمعاش، شرابی، ڈرگ ایڈکٹس، جواری، چور اسمگلر، نوسر باز، ڈاکو، اپنی

موجودگی کا ثبوت دینے والے، اور اپنی موجودگی کو غیر محسوس کرانے والے، اپنے شوہروں کی نگراں عورتیں، اپنی عورتوں کے نگراں مرد ،سلیبریٹیز مرد اور عورتوں کے ساتھ ان کے باڈی گارڈز، ایک جانب کسی کسی پول سے لپٹی ہوئی برہنہ لڑکیاں، بے شمار قوموں، رنگوں، نسلوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کسی چھوٹی سی ڈائیس پر اسٹرپٹیز پرفارم کرتی ہوئی لڑکیاں جو پانچ سے دس ڈالر کے عوض اپنا سب کچھ دکھانے پر تیار رہتیں۔ رقص، موسیقی، شور، جوانی، مستی، شراب، نشہ، جوا، ڈالروں کی ریل پیل کے اس عالم میں، خود شراب پینے، نیم مدہوش ہونے، کچھ لڑکیوں کو چھیڑنے، کچھ لڑکیوں کو گالیاں دینے، ایک آدھ سے گالی کھانے، کچھ مال جوئے میں لٹانے کے بعد میں اس قابل ہوا کہ اپنی بیوی کے بارے میں کچھ سوچتا۔۔اور جیسے ہی میں نے سوچا۔۔ میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔۔ ایک تجلّی۔۔ شاید ایسی ہی تجلّی پرنس سدھارتھ کے ذہن میں نمودار ہوئی تھی جب وہ دنوں ہفتوں یا شاید مہینوں ایک پیپل کے پیڑ کے نیچے گیان دھیان میں لگے رہے تھے۔۔ یہ بات پہلی مرتبہ اپنے ایک پرائمری کلاس کے ٹیچر سے سنی تھی۔۔ اس تجلّی کے بعد وہ پرنس سدھارتھ سے ''بدھا'' بنے تھے۔ میری تجلّی سے مجھے بھی کچھ بن جانا تھا۔۔ لیکن ضروری نہیں ہے جو کچھ ہونا ہے وہ فوری ہو جائے۔ اس ریاست میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی نیو برسوں پہلے رکھی گئی تھی۔۔ اور جو بہت بعد میں ہو گا اس کی داغ بیل آج ڈالی جا رہی ہے۔۔ ڈسکو کلب کے اس متوالے صدرنگے ہجوم میں اچانک وہ ہو جائے جو اس ریاست کی عبادت گاہوں میں ہو رہا ہے تو کیا ہو۔۔ ہنستے کھیلتے لوگوں پر اچانک نزول ہو دہشت، خوف، تباہی، بربادی، ٹوٹ پھوٹ، شور شرابہ، کراہیں، انسانی اعضاء کا جسموں سے علیحدہ ہونا، دور ونزدیک گرنا، سروں کا دھڑوں سے کٹ کر چھتوں اور دیواروں سے ٹکرانا، انسانی خون کا زخموں سے رِسنا، بہنا، اور کسی جسم سے فوارے کی طرح اڑنا، لوگوں کی بھگدڑ، مردہ جسموں سے الجھ کر گرتے ہوئے لوگ، اور مردہ یا نیم مردہ جسموں کو کچل کر گزرتے ہوئے لوگ، لیٹے لیٹے کراہتے اور چلّاتے لوگ، رینگ رینگ کر، گھسٹ گھسٹ کر اس قیامت والی جگہ سے باہر نکل جانے کی کوشش میں مصروف لوگ۔ چھوٹی عمر میں اپنی پرائمری ٹیچر سے میں نے سنا تھا کہ پرنس سدھارتھ (بھگوان بدھا) نے اپنی محل کی زندگی تج دیتے اور بچّے اور بیوی کو سوتا ہوا چھوڑتے سمے، اور بعد میں 'گیا' (ہندوستان) میں سچ کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹکتے ہوئے اور بالآخر پیپل کے پیڑ تلے آسن جما کر بیٹھنے کے دوران طرح طرح کے آزاروں اور دکھوں میں مبتلا مخلوق کا دھیان کیا تھا۔۔ میں بھی تو وہی کرنے لگا تھا۔ تو کیا میں دوسرا بدھ بھگوان بننے جا رہا تھا۔ لیکن میں ان سے قطعی مختلف آدمی تھا۔۔ وہ انسانوں کو دکھوں سے محفوظ کرنا چاہتے تھے اور میں۔۔ میں تو ایک بہت بڑی مشین کا پرزہ تھا جس کا کام ہے انسانوں کو دکھوں میں مبتلا کرنا۔۔ پرنس سدھارتھ نے اپنی جس جوان بیوی کو ترکِ دنیا کرتے سمے سوتا چھوڑا تھا اس پر دنیا خاموش تھی۔ اس کے بارے میں اگر کچھ ملتا بھی ہے تو اسکی نوعیّت، قیاس اور گپ شپ کے دائرے میں آتی تھی۔ میں نے بھی تو اپنی بیوی کو تنہا چھوڑا تھا۔۔ میری بیوی بھی مجھے اتنی ہی پیاری تھی جتنی پرنس کی بیوی پرنس کو پیاری تھی، جوانی ہم دونوں کی بیویوں کے درمیان قدر مشترک بھی تھی۔

ڈسکو کلب کی پُر ہجوم تنہائی میں بیوی کے بارے میں گیان کی جو روشنی میرے ذہن میں اتری تھی اس کے تحت میں نے بیوی سے پوچھا ''میری غیر موجودگی میں کوئی دوسرا مرد۔۔؟'' ایئر پورٹ جاتے ہوئے گاڑی میں چلا رہا تھا اور وہ میرے ساتھ اس طرح بیٹھی ہوئی

تھی کہ اس کا ایک چوتھائی بدن مجھ پر لدا ہوتھا۔ میرا سوال اس کے کانوں کے راستے اسکے دماغ میں اور دماغ سے شاید اسکے پورے بدن میں گونج گیا۔۔۔اس کا بدن اچانک تن گیا۔۔۔وہ مجھ سے علیحدہ ہوگئی اور تن کر بیٹھ گئی۔ میں اس کو کنکھیوں سے دیکھ کر اس کے اعضاء کی حرکات کا جائزہ لے رہا تھا۔ ریفلیکس ایکشن (غیر ارادی حرکات) پر میرا اچھا خاصا مطالعہ تھا۔ باڈی لینگویج سے واقف تھا۔ ''سیدھی ہوکر اور اپنی سڈول خوبصورت اور بے حد گوری ٹانگوں کو اکڑا کر بیٹھ گئی جیسے اس کا جسم کسی ناگہانی حملے سے بچنے کے لئے تیّار ہو گیا ہو۔ اس نے مجھے بغور دیکھا۔۔میرا چہرہ سنجیدہ تھا۔۔معمول کی مسکراہٹ سے بھی خالی۔۔''

''کیا یہ ایک سنجیدہ سوال ہے جو تم پوچھ رہے ہو۔۔؟''

''یس'' میں نے اس کے بعد 'میڈم' کہنے سے اپنے آپ کو بمشکل باز رکھا۔ اگر کہہ دیتا تو میری یہ ''یس'' خوفناک حد تک طنزیہ بن جاتی۔

''تم نے اس سوال کے لئے بہت ہی غلط وقت چنا ہے۔ کاش! تم کسی فرصت کے وقت پوچھتے اور میں تفصیل سے کام لیتی۔۔۔''

بولتے بولتے وہ رک گئی اور یوں لگا جیسے گاڑی کے شیشے سے باہر دیکھ رہی ہو۔ ایک لحظہ کے لیے ایسا بھی لگا جیسے وہ رو رہی ہو۔۔رونے پر قابو پا رہی ہو یا بس رونے والی ہو۔۔پھر اسی طرح شیشے سے دیکھتے ہوئے اس نے گریہ سے معمور آواز میں ایک ہلکا سا ''یس'' گاڑی کی بند فضا میں چھوڑ دیا۔ جو کسی سائلنسر لگی ہوئی گن سے نکلی ہوئی گولی کی طرح میرے ذہن میں پیوست ہوگیا۔

ایئرپورٹ پر جب میں ڈرائیونگ سیٹ سے نیچے اترا تو وہ میری جگہ کھسک آئی اور گاڑی پارک کرنے چلی گئی۔۔جس وقت وہ گاڑی پارک کر کے لوٹی میں کلیرنس لے چکا تھا۔ ہم دونوں نے آنکھیں نہیں ملائیں۔۔البتہ جب میں اپنی ہینڈ کیری گھسیٹتا ہوا دوسرے مسافروں کے ساتھ جہاز کی طرف جانے لگا تو وہ ایک جھٹکے کے ساتھ میرے سینے سے آ لگی اور دوسرے لمحے علیحدہ ہوگئی اور ایئرپورٹ کی بیرونی راہداری کی طرف اس کے قدم بڑھنے لگے۔ اس کی جانب دیکھے بغیر میں یہ بتا سکتا تھا کہ وہ آنسوؤں سے رو رہی تھی۔ میرا یہ سفر کس طرح کٹا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ بچپن میں آپ کبھی پتنگ اُڑا رہے ہوں، اچانک ہوا تیز ہوگئی ہو، ڈور سے پتنگ سنبھالنا مشکل ہوگیا ہو، اور پھر ڈور نہ صرف آپ کے ہاتھوں سے نکل گئی ہو بلکہ چرخی کو بھی اُڑا لے گئی ہو۔۔ مجھے تو ڈور سنبھالنے کی کوشش کرنے کا موقع ہی نہیں نصیب ہوا اور میری بیوی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔۔۔اسکو تیز ہوا لے گئی۔۔ہوا جو قدرت کا مظہر ہے۔ حالات کا سمبل ہے۔ جس پر میرا یا میری بیوی کا کوئی قابو نہیں۔۔ ہماری جدائی۔۔اس کی تنہائی۔۔تنہای کی طویل شام اور لمبی رات جس کی اسکو عادت ہی نہیں تھی۔۔جب وہ پہلی بار میرے بغیر گھر میں رہی ہوگی تو گھر کے طوطوں اور کتّے نے اسے ضرور رفاقت دی ہوگی سفید چوہے نے کچھ دیر اسے لُبھائے بھی رکھا ہوگا یا پھر ان سب نے اس کے تنہا رہ جانے کے احساس کو گھٹن کی حد تک پہنچا دیا ہوگا۔ گھر اسے کاٹنے دوڑا ہوگا اور وہ گھر سے باہر دوڑ گئی ہوگی اور اور۔۔ پھر اسکا ایکسپوژر ہو گیا ہو گا۔ اس ہزار پا، اکٹوپس کے سامنے جس کو عرفِ عام میں دنیا کہا جاتا ہے۔۔ میں نے ہمیشہ اسے ایکسپوز ہونے سے بچایا تھا۔ کاش! میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔۔ اس کو تھوڑا تھوڑا ایکسپوژ ہونے دیا ہوتا۔۔ کیا میری بیوی واقعی ایک پتنگ تھی جسکو تیز ہوا اڑا لے گئی تھی۔ میری غیر متوقع اور اچانک جدائی کی تیز ہوا۔۔۔یا میری پتنگ کو کسی شاطر پتنگ باز نے پہلے کاٹا اور پھر لوٹ لیا تھا۔۔ میری سوچ جب اس مرحلے پر پہنچی تو جیسے سب کچھ بدل گیا۔۔۔ سارا ماحول بدل گیا۔۔ ماحول کیا بدل گیا۔۔؟ بدلتا

جب کچھ ہوتا، وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔۔۔ جہاز جس میں بیٹھا تھا۔۔۔ مسافر۔۔۔ چھوٹے بڑے کاموں کے سلسلے میں ادھر اُدھر گشت کرتی ہوئی ہوسٹس لڑکیاں۔۔۔ سب کچھ جیسے ہوا میں تحلیل ہو چکا تھا اور اسی ہوا میں۔۔۔ میں اڑتا ہوا جا رہا تھا۔۔ میری شرٹ کے اندر جیکٹ تھا ایسا ہی جیکٹ جو عام طور پر خود کُش حملہ آور پہنتے ہیں۔ میرا ٹارگٹ تھا خود اپنے گھر کو دھماکے سے اُڑا دینا کیونکہ اس گھر میں وہ پہنچ چکا ہو گا۔۔ میری بیوی کی تنہائی دور کرنے۔۔

جہاں تک میں اپنی بیوی کو جانتا تھا اس کی بنیاد پر اب میں وثوق سے یہ بات کہہ سکتا تھا کہ میری بیوی نے اپنے آپکو محض اس لئے شراب کے سپرد کیا تھا کہ اس کی زندگی میں ''وہ'' داخل ہو گیا تھا۔ میری بیوی اس قماش کی لڑکی تھی کہ وہ نہ تو میری زندگی میں کسی عورت کو برداشت کر سکتی تھی اور نہ ہی اپنی زندگی میں کسی مرد کو۔۔ اور جب اس کی زندگی میں ''وہ'' داخل ہو گیا تو اس کے اندر کی لڑکی کو زبردست دھچکا لگا۔ اس دھچکے کو وہ سہہ نہ پائی اور خود کو شراب میں غرق کر دیا۔۔ ایک لمحہ کے لئے میرے دل کے کسی گوشے میں میری بیوی کے لئے پیار جاگا ۔۔لیکن میں تو بدل چکا تھا۔۔ میں۔۔۔ میں نہیں رہا تھا ورنہ اس احمقانہ مشن پر کیسے روانہ ہوتا۔۔ میں اسکو حماقت، دیوانگی، اور غیر انسانی وحشیانہ زندگی سے تعبیر کرتا تھا۔۔ ایسے کام وہی لوگ سرانجام دیتے ہیں جن کے سر میں یا تو دماغ سرے سے ہوتا ہی نہیں ہے اور ہوتا بھی ہے تو اس پر کسی ماسٹر مائنڈ کا قبضہ ہو چکا ہوتا ہے۔۔

یہ میں ہی تھا جو جہاز میں سوار اپنے مشن کی کی تکمیل کرنے جا رہا تھا۔۔ اور یہ بھی میں ہی تھا جو جہاز کے باہر الٹی سمت ہوا میں اُڑتا ہوا اپنے ہی گھر کو دھماکے سے اڑانے جا رہا تھا۔۔ محض اس لئے کہ گھر میں ''وہ'' پہنچ چکا ہو گا اور مجھے اسے اڑانا تھا۔ اگر میں نے یہ دھماکہ کیا تو گھر کے دوسرے مکینوں کا کیا ہو گا۔ میرا اور میری بیوی کا عزیز از جان کتّا، جو باہر سے بدصورت اور اندر سے خوبصورت تھا۔۔۔ چھوٹی ذات کے طوطوں کا جنہیں ہم نے بڑے چاؤ سے پالا تھا۔۔ سفید چوہے کا جسکی ہم اپنے خاص مہمانوں کو زیارت کراتے تھے۔۔؟ اور میری بیوی کا۔۔۔ جو میرا سب سے قیمتی اثاثہ تھی۔۔؟

اس سے پہلے کہ میں ہوا میں اڑتا ہوا اپنے ٹارگٹ پر حملہ آور ہوتا میرا جہاز زمین پر اتر کر ٹیکسی کرنے لگا۔ اسکے ساتھ ہی مجھے ہوش آ گیا۔ میں اپنے ذہن کو سمیٹ کر اس مشن پر مرکوز کرنے لگا جو میرے ملک کی جانب سے اسائن کیا گیا تھا۔۔ جسکا مقصد مذکورہ ریاست کو تہ و بالا کرنا تھا۔۔ یہ مشن بھی غیر انسانی اور وحشیانہ تھا لیکن میرے ماسٹر مائنڈ کے مطابق اسکا مقصد امن کا فروغ، کلچر کا بڑھاوا تھا۔ سب سے اہم نکتہ جو میرے اور میرے ساتھ فرائضِ منصبی ادا کرنے والے ساتھیوں کو فیڈ کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ اس مشن کی تکمیل اور اس ریاست کے پرخچے اڑانے اور لاتعداد آدمیوں، فوجی، غیر فوجی، مرد، عورت اور بچّوں کی اموات کے بعد ہمارا ملک پہلے سے زیادہ محفوظ ہو گا۔۔۔ میں اور میرے اس مشن کے ساتھ آدمی کم اور ''پروگرام'' روبوٹس زیادہ تھے۔۔۔ کیا آدمی 'پروگرامڈ' رہنے کے بعد بھی آدمی رہتا ہو گا۔۔؟ اگر آدمی رہتا بھی ہو گا تو کتنا۔۔؟ میں جو کچھ بھی اپنے ساتھ جہاز سے لے کر اترا تھا وہ ریاست کی پیٹھ پر آخری تنکا تھا۔۔۔ یا شاید اس سے بہت زیادہ۔۔۔ میں جانتا تھا کہ ریاست کے بھک سے اڑ جانے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی۔۔۔ میں پروگرامڈ روبوٹ جو اپنے اندر رمق برابر 'آدمی' کو برقرار

رکھنے میں کامیاب ہو رہا تھا پہلی فرصت میں یہ انتظام کرلیا تھا کہ میری بیوی اوراس کے ''وہ'' کی نہ صرف نگرانی کی جا سکے بلکہ اس کی شناخت ،اس کے بارے میں وائٹل معلومات ،اس کی تصویر، میری بیوی کے ساتھ اسکی تصاویر جلد از جلد مجھ کو مہیا ہو جائیں ۔ یہ سب کام انتہائی راز داری اور پیشہ ورانہ انداز سے انجام پایا۔اس کام میں بمشکل تین دن لگے۔ساتھ ہی میں جو کچھ لے کر پہنچا تھا وہ انتہائی تیزی سے نتیجے کی طرف بڑھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے بعد کسی اور اقدام کی ضرورت نہیں پڑنی تھی ۔ یہ قطعی طور پر آخری اقدام تھا اس کے بعد جو کچھ بھی ہونا تھا،خود کار ہونا تھا۔اگر چہ تباہی اور بربادی،خون خرابہ بھی انتہا کا ہونا تھا لیکن کیا کیا جائے ایسے کاموں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔اس دن کے آخری ٹارگٹ کو میری نگرانی میں تکمیل پانا تھا۔۔میں اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لئے نکل چکا تھا کہ مجھکو ، میرے گھر کے ، میری بیوی کے بارے میں ایک لفافہ ملا۔(یہ میرا خانگی معاعلہ تھا اور اس معاملے میں کمپیوٹر کو ذریعہ نہیں بنایا جا سکتا تھا) میں نے لفافہ بند ہی رہنے دیا اور اسے اندرونی جیب میں ٹھونس لیا۔۔میری پہلی ترجیح اپنے فرضِ منصبی کی تکمیل تھی اور میں جان و دل سے اس کام میں جُٹ گیا۔۔اچانک میرے ذہن میں وہی روشنی ، وہی تجلّی ، پھوٹ گئی جس کا ذکر اس سے قبل (گیا) انڈیا کے پرنس سدھارتھ گوتم بدھ کے حوالے سے کر چکا ہوں۔مجھ کو اور میرے دو ساتھیوں کو اس آخری مشن کی بھینٹ چڑھنا تھا اور میرے ملک نے اسکی تیاّری کر لی تھی کہ ہم تینوں کسی طرح بچ نہ نکلیں ۔ ہمارے ملک کے اپنے مامور کئیے ہوئے آدمی محفوظ فاصلوں پر اس حکم کے ساتھ موجود تھے کہ ہمارے بچ نکلنے کی صورت میں ہمیں نشانہ بنا لیا جائے ۔ یہ میرا آخری مشن ہی نہیں بلکہ میری زندگی کا آخری دن تھا میرا مرنا لکھا جا چکا تھا اور یقینی تھا۔۔میں پہلی مرتبہ اس سے رجوع ہوا جو کہیں نہ کہیں موجود ہے اور وقتِ آخر ہر آدمی اس سے رجوع ہوتا ہے۔میرے اندر سے گریہ ایک فوّارے کی طرح جاری ہوا۔ روتے دل، روتی آنکھیں، روتے لبوں میں نے اس ہستی سے گڑ گڑا کر معافی مانگی ۔۔اگر چہ جو کچھ میں نے کیا تھا اپنا فرضِ منصبی سمجھ کر کیا۔ لیکن خلقِ خدا کی اس کثرت سے اموات ،تباہی ، بربادی ،خون خرابہ کتنا وحشیانہ اور غیر انسانی لگا،اس وقت جب کہ میں خود مرنے جا رہا تھا۔۔اس حالت میں نہ جانے کیسے میں نے وہ لفافہ اپنی اندرونی جیب سے برآمد کیا اور اس کو چاک کر دیا اس کے اندر سے میری بیوی کے ساتھ ''اس'' کے فوٹو برآمد ہوئے ۔ممکن ہے اپنی موت کو اتنا قریب دیکھ کر میری بینائی میں خلل واقع ہو گیا ہو۔ ہر فوٹو میں 'وہ' ہنس رہا تھا۔وہ ایک مقامی تھا۔ میں نے اسے ریاست میں دیکھا تھا یا شاید اس سے بات بھی کی تھی ۔ یاد آیا۔۔میرے ملک اور ریاست کی مشترکہ انجمن کے سالانہ ڈنر میں ۔ پیشے سے وہ انجینئر تھا۔میرے ملک میں جاب کرتا تھا ،اسی فرم میں ،جس میں میری بیوی ملازم تھی ۔تصویر کے پیچھے لکھی ہوئی مزید معلومات پڑھنے کا موقع نہ مل سکا۔۔میرا مشن پورا ہو چکا تھا۔۔۔میری موت آ چکی تھی۔۔۔

☆☆☆

......عورت اور بچہ......

او مائی گاڈ! تین دن ہونے کو آئے مگر کوئی وے آؤٹ سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔ فضل جان بولتا تھا، سامان سب کا سب ختم ہو رہا ہے۔ کھانے پینے کا بھی۔'' ہنری مارسٹن تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ اس کے ہاتھ میں وہسکی کا گلاس تھا جس کو وہ قطرہ قطرہ چوس رہا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی اپنی اپنی کرسیوں پر چپ چاپ بیٹھے تھے۔

ہنری مارسٹن جس کو سب ہنیری پکارتے تھے۔ ادھیڑ عمر کا امریکی تھا جسکے سرخ بال اور کلین شیو چہرہ کسی مووی ہیرو جیسا تھا۔ کہنے کو تو وہ ایک امریکی سیاح کے علاوہ کچھ نہ تھا لیکن زیادہ وقت وہ کچھ نہ کچھ ڈسپیچ کرتا ہوا ملتا۔ اس کے دونوں ساتھیوں کا خیال تھا کہ وہ کسی مشن پر نکلا ہوا بندہ ہے۔ سی آئی اے کا ایجنٹ یا پینٹا گون کا اپنا تجزیہ کار، فضل جان کی نظروں میں وہ ایک خوش مزاج گورا تھا جو بڑے آدمیوں کو سگار اور چھوٹے لوگوں میں سگریٹ بانٹتا پھرتا تھا اور جس کا ایک دانت غائب تھا۔ دوسرے دو باہر والوں میں سے ایک کو فضل جان دل ہی دل میں ''شٹ صاب'' کے نام سے جانتا تھا جب کہ اس کا اصل نام ولیم فرڈی نینڈ تھا۔ وہ بات بات پر 'شٹ' کہتا رہتا اور ساتھ ہی اپنے داہنے کان کی لو کو کھینچتا۔ اس عادت سے اس کا داہنا کان نیچے لٹک آیا تھا۔ وہ عمر میں امریکی ہیری سے بہت چھوٹا تھا۔ ہیری اس سے بہت پیار کرنے لگا تھا۔ اکثر وِلی (ولیم فرڈی نینڈ) کے گالوں اور پٹھوں پر ہاتھ پھیرتا رہتا۔ وِلی مشہور مغربی نیوز ایجنسی یونائیٹڈ میڈیا یوروپا۔۔۔ یوایم یو سے متعلق تھا۔ تیسرا فرنگی جس کو فضل جان اپنے طور پر تیمور لنگ کے نام سے جانتا تھا (اس کے بائیں پیر میں لنگ تھا) پریرا جوزی فیرا ایک گٹھیلے بدن اور فرنچ کٹ داڑھی مونچھوں والا جواں سال اطالوی تھا۔ بظاہر اس کا تعلق کسی اطالوی اور فرانسیسی مشترکہ میڈیا ادارے سے تھا لیکن وہ اور بھی بہت سارے کاموں میں ملوث ہو جانے کا عادی تھا۔ اس لیے اس کا اصل روپ کسی پر کھلتا نہ تھا۔ اس کے دونوں ساتھی اس کو شبہے کی نظر سے دیکھتے۔ اس پر ڈبل ایجنٹ ہونے کا بھی گمان گزرتا تھا۔ خود فضل جان بھی اس سے خائف رہتا تھا۔ ان تینوں نے فضل جان کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں جو ان علاقوں میں باہر والوں کی رہ نمائی کر کے اپنی روزی روٹی کماتا تھا۔ علاقے کے لوگ فرنگیوں سے روابط کی وجہ سے اس سے بیزار رہتے۔ لیکن اس کے باوجود اس کو برداشت کر لیتے تھے کیوں کہ ایک تو وہ بے حد خوش مزاج تھا، دوسرے وہ علاقے کے لوگوں کے بہت سے مسائل اپنے فرنگی شناساؤں کے اثر و رسوخ کی مدد سے حل کروا لیتا تھا۔ وہ باہر والوں کے لیے جیسے وقف ہو چکا تھا۔ قوم قوم کے، ملک ملک کے اور بھانت بھانت کے فرنگی اس کی حوالگی میں یا یہ ان کی حوالگی میں آتا رہتا۔ فضل جان کے دائرۂ عمل کی کوئی حد نہیں تھی۔ دیکھو تو وہ ڈیڑھ پسلی کا، سوکھا، زرد رو، میانہ قد کا ادھیڑ عمر آدمی تھا لیکن جب وہ چلتا اور خاص کر سامان سر پر یا کندھے پر اٹھا کر تو اس کے اندر کی توانائی اور باہر کی پھرتی حیران کر دیتی، وہ پہاڑی راستوں، زمینی کچے پکے راستوں اور برف زاروں پر یکساں رفتار سے چلنے کی صلاحیت

کا مالک تھا۔ رسّی اور چوبی تختوں کے جھولتے جھالتے پُلوں پر بوجھ اٹھا کر چلنے کی اس کو خاص مہارت تھی۔ اس کی ان صلاحیتوں کا شہرہ جتنا سرحد کے اِس طرف تھا، اتنا ہی سرحد کے اُس طرف تھا۔ مختلف زبانیں وہ روانی سے بولتا بشمول سرائیکی اور اردو۔ ہنر بھی وہ بہت سارے جانتا تھا۔ نمازی تھا، باریش تھا—— ہنستا بہت تھا۔ وہ جب ہنستا تو اس کی دونوں باچھیں کانوں سے مل جاتیں۔ دانت چمکاتا لیکن آواز قطعی نہ پیدا کرتا۔ چٹانوں سے ترشے ہوئے لوگ ہی یوں بے آواز ہنس سکتے ہیں۔ فضل جان کی کوئی نجی زندگی تھی یا نہ تھی، اس کے بارے میں صرف افواہیں تھیں اور بس۔ اس معاملے میں وہ اپنی زبان بند رکھتا تھا۔ مشہور تھا کہ اس کا ایک بوڑھا باپ ہے۔ اس کی بیوی مر چکی ہے اور اس کا اکلوتا بیٹا کہیں گم ہو گیا ہے۔ یہ بھی مشہور تھا کہ اس نے شادی ہی نہیں کی۔ وہ جیسا تھا، اس کی ذاتی یا نجی زندگی جیسی بھی تھی لیکن رہتا تھا وہ خطرات میں گھرا ہوا۔ سرحد کی دونوں جانب کی آمد و رفت اکثر خلافِ قانون ہوتی اور اس طرح وہ دونوں جانب سرحد کے پاسبانوں کے نشانے کی زد میں ہوتا۔ اس کے علاوہ زمینی اور فضائی فوجی کارروائیوں کی زد میں بھی رہتا۔ بوڑھے بڑوں نے جب اس کو ٹوکا تو وہ کسی سوال کا تشفی بخش جواب نہ دے سکا تھا۔ محض روٹی روزی کے لیے ایسی پُرخطر زندگی گزارنے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا تھا۔ نظر رکھنے والوں نے اس پر نظر رکھی ہوئی تھی، لیکن ہنوز اس کے خلاف کچھ بھی سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ خود بھی شاید نہ جانتا تھا کہ اس نے یہ زندگی کیوں اختیار کر رکھی تھی۔ اس نے شاید اپنے آپ کو ایسا ہی پایا تھا—— اور بس۔ تاہم ان تینوں باہر والوں سے خود فضل جان بیزار ہو رہا تھا۔ اگر موسم راستہ نہ روکتا تو وہ ان تینوں سے جلد از جلد چھٹکارا پا لیتا۔ وہ تینوں افغان سرحد کے اس پار سے اس کے ساتھ لگے تھے۔ فضل جان نے جلد ہی یہ تاڑ لیا تھا کہ ان کا معاملہ معمول کے مطابق نہیں تھا۔ ان کی حرکات و سکنات، عام سیاحوں، میڈیا کے لوگوں اور رپورٹروں سے زیادہ لگّا نہیں کھاتی تھیں۔ وہ ان تینوں پر سختی سے نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ اگر کوئی بھی خلافِ معمول بات دیکھنے میں آئی تو وہ دونوں طرف کی حکومتوں سے مخبری کرنے میں پس و پیش نہ کرے گا۔ البتہ اس کا اصول تھا جس ملک کی سرحد میں جو ہو رہا ہے، اس ملک سے مخبری—— وہ اس سے باخبر تھا کہ مخبری میں جان جوکھم اور خطرات زیادہ ہیں لیکن اندر سے وہ ایک محبِ وطن تھا۔ اگرچہ اس کی وطنیت دو ملکوں پر محیط تھی۔ پتھر کے لوگوں کے معاملات خواہ کتنے ہی سیدھے سادے ہوں، ہوتے ان کی اپنی ذاتی منطق کے مطابق۔ سرحد کے اُدھر سے یہ لوگ ساتھ ہوئے تھے۔ فضل جان ان کی ہمرہی اور رفاقت کو معمول سے ہٹا ہوا پا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں عجیب عجیب الجھنیں پرورش پا رہی تھیں۔ ان میں سب سے مضحکہ خیز بات یہ تھی کہ وِلی (شٹ) میں کچھ ایسا ویسا ہے۔ امردوں جیسا—— اسی طرح ہیری اور پریرا (تیمور لنگ) کے درمیان رقابت جیسا تھا—— ولی کو لے کر—— اس خیال پر وہ دانت نکال کر ہنسنے لگتا تھا۔ بہر حال تینوں کے درمیان کچھ ضرور تھا۔ یہ کھل نہیں رہا تھا کہ ان تینوں میں کوئی آپسی (باہمی) جھگڑا تھا یا باہر کا کوئی معاملہ تھا جو ان پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ تینوں بے حد پریشان لگتے تھے یا شاید ڈرے ہوئے—— فضل جان معاملے کی ٹوہ میں تھا۔ یہ طے تھا کہ تینوں خوف زدہ تھے، البتہ یہ واضح نہیں ہو رہا تھا کہ ان کے خوف کا سرچشمہ کیا—— ؟ اور کہاں تھا—— ؟ موسم کی خرابی نے ان کو قریب قریب قید کر دیا تھا۔ اس قید کی بندش کو، ان تینوں کے علاوہ فضل جان بھی محسوس کر رہا تھا۔ یوں تو ہر سال ہی ان دنوں ژالہ باری ہوتی تھی لیکن اس سال تو خدا کی پناہ—— ژالہ باری تھی یا قہرِ خداوندی۔

ہیری نے اپنی ذہنی کیفیت، کرب اور بوریت کچھ اس طرح بیان کر دی تھی کہ وِلی اور پریرا کے لیے کچھ کہنے کو رہا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ وہ

دونوں صرف آنکھیں اٹھا کر رہ گئے۔ اسی دوران ہیری کو شاید کچھ یاد آ گیا— اس نے کہیں کوئی خاموش پیغام بھیجنے کی کوشش کی۔ وِلی اس کی حرکات اور چہرے کی زبان پڑھتا رہا۔ وہ اور پریرا دونوں ہیری کی مشکل کو بھانپ گئے تھے۔ موسم نے ان اسب کے مواصلاتی رابطوں کو متاثر کر رکھا تھا۔ شاید قدرت آج کے ترقی یافتہ آدمی کو اس کی اوقات بتانے پر تُل گئی تھی۔ جب سے ''موسم کے اچانک شدت اختیار کرنے سے ایک چھوٹے سے ٹوٹے پھوٹے پہاڑی ریسٹ ہاؤس میں نظر بند ہوئے تھے۔ ان کے اندر کے آدمیوں نے باہر آنا شروع کر دیا تھا جو آدمی کم اور جانور زیادہ تھے۔ کھانے کا انتظام تو فضل جان کر ہی دیتا تھا۔ پینے کا اسٹاک وہ خود لائے تھے لیکن انسانوں کی آدمیت یا آدمیوں کی حیوانیت جب پیٹ کے مشکیزوں کو بھرنے سے فارغ ہوتی ہے تو ایک اور بھوک یا پیاس اس کی اولین طلب بن کر ابھرتی ہے جس کے لئے آغاز ہی میں فضل جان نے مناعی کر دی تھی۔

''اِف یو وانٹ وومن— سوری— آئی وِل بی دی لاسٹ مین ٹو سپلائی وومن— اینڈ لُک— لِسن ٹو می— آئی وارن یو— اِٹ اِز ویری رِسکی— ڈینجرس پیوپل وِل شور کِل یو—'' الٹی سیدھی انگریزی میں اس الٹی سیدھی تقریر سے جو اس نے رٹ رکھی تھی یا کسی نے رٹا دی تھی، وہ باہر والوں سے معاملات طے کرتا تھا— ''نو گرل، نو وومن، نو کسنگ، نو ہگنگ، نو فلنگ، نو ڈرگ— ویری بیڈ— ویری ڈینجرس—''

اس گروپ کی ایک خصوصیت فضل جان کے لیے آسانیاں پیدا کرتی تھی۔ وہ تھی، ان کی مشترکہ بات چیت کی زبان۔ وہ انگریزی میں بات کرتے تھے۔ انگریزی بھی ان زبانوں میں سے ایک تھی جن کو جاننے کا وہ دعوےدار تھا۔ ''آئی نو دی بلڈی انگلش لینگویج۔'' اپنے لوگوں میں بیٹھ کر وہ شائے (چائے) سُڑپ کر پیتے ہوئے فخر سے اعلان کرتا۔ ایسے اعلانات کرتے وقت اس کی داڑھی میں ایک دو چائے کے قطرے جھلکتے اور پاس بیٹھے ہوئے لوگوں— بچوں، جوان اور بوڑھوں کی نگاہوں میں قدردانی سے لے کر رشک وحسد کے جذبات فرداً فرداً، جدا جدا انداز میں چمک اٹھتے۔ اس کی یہ انگریزی دانی ہی تو تھی جس نے اس کو ان تینوں باہر والوں کے بارے میں محتاط بنایا تھا۔ ان کے کم عمر ساتھی وِلی میں اس امریکی ہیری اور اطالوی پریرا کی معمول سے ہٹی ہوئی رقیبانہ انداز کی جسمانی دلچسپیاں اس کے لیے ناقابل قبول تھیں۔ ''ان پسرانِ خنزیر کو دیکھو۔ عورت سے روکا تو اپنے ہی ساتھی پر ٹوٹ پڑے۔ باتیں تو سنو ان کی— وِلی ڈیئر— اس پریرا سے بچ کر رہنا، یہ اٹالین ہے۔ تم ان اٹالینس کو نہیں جانتے۔ وہ اٹالین نہیں جو اپنی عورت کو گالی نہ دے یا نہ مارے پیٹے— اور......'' ''اور، اور کیا؟'' اور میرے سویٹ یانکی بڈھے آلو خور''— پریرا ہیری کی بات کاٹ کر للکارا— میں نے بولا نا، ذرا اپنی حفاظت کرنا اس اٹالین پیزا خور بھیڑئے سے، یہ عورت مرد، دونوں ہی پر ہاتھ صاف کر لیتے ہیں۔ ہیری کہہ رہا ہوتا، وِلی ان دونوں کی طرف دیکھ کر مسکراتا رہتا۔

فضل جان چلتے پھرتے اور مختلف کام نمٹاتے ہوئے ان کی فقرے بازی سے کچھ مفہوم اخذ کرنے کی کوشش کرتا رہتا— ''کیا اطالوی ایسے ہوتے ہیں؟'' وہ سوچتا لیکن اس کے ذہن میں دوسرے ہی لمحے یہ سوال ابھرتا ''ہیری تو امریکی ہے۔ تو پھر یہ کیوں وِلیم شٹ کے پیچھے پڑا ہے۔ کبھی اس کے گالوں کو انگلیوں میں بھرتا ہے تو کبھی کہیں کہیں ہاتھ پھیرتا ہے۔ فضل جان اپنے اَن پڑھ لیکن زندگی کے رگڑ کھائے ہوئے دماغ سے سوچتا ''وہ تینوں ہنستے بھی تو رہتے ہیں۔ تو کیا یہ سب زبانی جمع خرچ ہے جس کا نتیجہ محض صفر— چلو اس کو چھوڑو، محض ٹائم پاس لیکن اس کو کس کھاتے میں ڈالے جو وہ دو تین روز سے سن رہا تھا— ''میں شرطیہ بتا سکتا ہوں کہ تم اس وقت کیا سوچ رہے ہو؟'' وِلی

ہیری سے مخاطب تھا— ''یہ تو میں بھی بتا سکتا ہوں۔'' پریرا بولا، ''تم دونوں اپنی اپنی جگہ بڑے مائنڈ ریڈر بن رہے ہو۔تم سوچتے ہو کہ میرے چہرے سے میرا ذہن پڑھنے میں کامیاب ہو گئے ۔گرواَپ گائیز— میں بے حد سنجیدہ ہوں بلکہ کوائٹ اے بٹ وَریڈ بھی— تم یہی کہو گے نا کہ میں اس ڈیم ویدر کے بارے میں سوچ رہا ہوں—'' اور سوچ رہا ہوں کب موسم ٹھیک ہو گا اور کب— ہم یہاں سے نکلیں گے—؟ وائز گائیز۔'' ہیری کے اس تقریر نما فقرے پر دونوں ہنس پڑے اور قریب قریب بیک وقت دونوں ہی بول پڑے،''غلط بالکل غلط ''۔یہ سن کر ہیری کی سنجیدگی ایک دم گمبھیر ہو گئی لیکن وہ کچھ نہ بولا۔فضل جان جو موقع پر موجود تھا،صورتِ حال کو بھانپ گیا— وہ ایسے حالت سے اکثر دوچار ہوتا رہتا جب اس کی موجودگی اہلِ محفل کے لیے نا قابل قبول ہوتی ۔ایسے موقعوں پر وہ تھوڑی دیر وہی کچھ کرتا رہتا جو کچھ وہ کرتا ہوتا پورے انہماک کے ساتھ۔البتہ اس کام کے ختم ہوتے ہی باہر چلا جاتا۔فضل جان نے اس وقت بھی وہی کیا اور اچھی طرح اپنا جانا ان لوگوں کو محسوس ہونے دیا۔اس نے باہر ایسی آوازیں پیدا کیں جو ان کے کمرے تک جا سکیں۔اپنے پیروں کی چاپ بھی سنائی۔

وہ ہال میں آتش دان کے گرد جمع تھے۔برطانوی عہد کے یادگار ریسٹ ہاؤس میں جس کی تختی آدھی سے زیادہ ٹوٹ کر علیحدہ ہو چکی تھی اور بچی ہوئی آدھی سے کم تختی پر لکھا تھا— شیڈ وز ریسٹ ہاؤس۔(کہا جاتا ہے کہ اس سے پہلے لفظ ہینٹنگ تھا) فضل جان باہر آیا۔وہ سوچنے لگا کہ اگر وہ آؤٹ ہاؤس کی طرف نکل گیا تو ان لوگوں کی آوازوں کی سرحد سے دور ہو جائے گا۔اس خیال کے ساتھ ہی وہ دبے پاؤں ہال کی جانب لوٹا۔اس نے آتش دان کے لیے کوئلوں کی کشتی اٹھالی تا کہ اگر کوئی ہال سے باہر آئے تو اس کو مصروف بہ کار پائے۔اب جو اس نے کان لگائے تو باہر والے قدرے ہلکی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔شاید کسی عورت کے بارے میں بات کر رہے تھے۔وہ عورت اپنے بچے کی کہانی اُن تک پہنچانا چاہتی تھی۔اس کا یہ کہنا تھا کہ وہ ایک عورت ہے اور نہیں چاہتی کہ اس کو موضوعِ گفتگو بنایا جائے۔وہ اپنے بچے کی کہانی دنیا تک پہنچانا چاہتی ہے۔پریرا کی آواز صاف آنے لگی،''نا قابل یقین— وہ عورت مجھے بھی ملی تھی اور یہی کچھ اس نے مجھ سے بھی کہا تھا۔'' ''او مائی گاڈ— تم کو بھی وہی عورت ملی،اسی کہانی کے ساتھ۔'' ہیری نے خاصی بلند آواز میں کہا— ''کیسی عورت؟ کیسا بچہ؟ کیسی کہانی؟ لگتا ہے آپ دونوں ایک ساتھ خواب دیکھنے لگے ہو—'' وِلی نے قدرے دھیمی آواز میں دونوں کا مذاق اڑایا۔''وِلی مائی ڈیئر— ایک ہی عورت کا ہم دونوں سے ملنا اور ایک ہی کہانی سنانا— اِٹ اِز ڈیم رِیئل— یا پھر ہمیں پھنسانے کے لیے کوئی چال بھی ہو سکتی ہے؟'' ہیری بولا،'' چال— میں تو وہی ہوں جو میں اپنے کاغذات میں ہوں۔ایک رپورٹر اور تجزیہ کار— نہ تو پریرا کی مانند ڈبل ایجنٹ اور نہ ہی تمہاری طرح حکومتیں کمزور کرنے والا سازشی۔'' وِلی نے ہیری سے مخاطب ہو کر کہا،''کوئی مجھے کیوں پھنسائے گا۔آئی ایم آؤٹ آف یور بلڈی فلنگ گیم— سوری جنٹلمین۔'' اس کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی۔اس خاموشی کو ہیری کی آواز نے توڑا،''وِلی مائی بوائے، میں بھی تم کو اس معاملے سے الگ رکھنا پسند کروں گا، بشرطیکہ یہ اطالوی ٹھگ تمہارا پیچھا چھوڑ دے۔'' ''تم اپنا منہ بند رکھو گے یا ہم سب کو خطرے میں ڈالو گے؟ بہتر ہے چپ کرو۔موسمی پیش گوئی کے مطابق کل سے موسم بہتر ہونے لگے گا۔پہلا موقع حاصل ہوتے ہی ہم یہاں سے نکل چلیں گے۔'' پریرا نے رک رک کے بے حد دھیمی آواز میں کہا۔''شور کو پٹر مہیا نہ ہو سکا تو ہم مقامی لوگوں کے لباس اور حلیے میں، کسی لاری میں بیٹھ کر آگے

کے لئے روانہ ہو جائیں گے— کیوں گائیز—؟'' وِلی نے پُر اعتماد لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا،'' دیٹس اِٹ۔'' ہیری بولا ،'' دیٹس اِٹ'' پر یرا نے ہیری کی پیروی کی—'' اور ہاں، اگلی منزل میں— میں آؤٹ— تمہارے معاملات سے باہر۔'' یہ وِلی کی آواز تھی۔ فضل جان کے لیے اتنا ہی کافی تھا جو اس نے سنا— ہیری سگار اور سگریٹ کے نذرانے تقسیم کرنے والا اور پر یرا تیمور لنگ دونوں ہی ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث تھے۔ البتہ وِلی شاید— محض رپورٹر— لیکن کسے پتا، ان فرنگیوں کا کیا ٹھکانا۔ بہرحال اب وہ ان کے سامنے کھل کر آنا بہتر سمجھ رہا تھا۔ چنانچہ وہ زور سے کھنکھارا اور ہال میں ان کے سامنے آ گیا۔ اس کی مخصوص کھنکھار سے تینوں واقف تھے۔ یہی اس کی دستک یا ناکنگ تھی۔ اس کو چند تکلیف دہ اعلان کرنے تھے۔'' نمبر ون— آج ڈنر پر وہ صرف اُبلے آلو اور اگر وہ پسند کریں 'نان' مہیا کر سکتا ہے۔ بریڈ ختم اور ہاں بیئر بھی ختم— نو وہسکی— تھوڑی جن بچ رہی ہے لیکن اس کے ساتھ موسمی یا مالٹے نہیں مل سکتے۔ پر یرا صاحب کی لیور کی ٹکیاں بھی فنش ہو چکیں۔'' تینوں نے ڈنر کے لئے نان اور ممکن ہو سکے تو کسی طرح کے مقامی شوربے کا آرڈر کر دیا۔ جب ہال سے باہر قدم رکھ رہا تھا، پر یرا کی ملتجیانہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ پر یرا کہہ رہا تھا— ممکن ہو تو تھوڑی سی افیم کا انتظام کرے، سونے سے قبل وہ افیم آزمانا چاہتا ہے۔ دوسرے پر یرا کی اس فرمائش پر ہنسنے لگے تھے۔ فضل جان ان تینوں کے سامنے ایک خاص انداز سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے دونوں پیر آپس میں جوڑ رکھے تھے اور دونوں بازو سیدھے لٹکا کر اپنی دونوں ہتھیلیوں کو جسم سے چپکا رکھا تھا۔ وہ جب بھی باہر والوں کی کسی فرمائش کو منع کرتا تو اسی انداز سے کھڑا ہوتا تھا۔ پر یرا نے فضل جان کے کھڑے ہونے کے انداز کا مطلب سمجھ لیا اور خود ہی بول پڑا،'' ویل فضل جان! اگر تُم انتظام نہیں کر سکتا تو کوئی بات نہیں، ہم گزارا کر لے گا۔'' '' پر یرا صاب، تم ٹھیک سمجھا۔ ہم تم کو افیم نہیں لا کر دے سکتا— اِٹ اِز ڈرگ— ہم مسلمان ہو کر بھی تم کو پینے کو دیتا۔ اسلام کا گاڈ شراب کو حرام کیا ہے پھر بھی— مگر ڈرگ— نو— سوری— جیسا ہم نے بولا تھا— نو وومن— نو ڈرگ— نو— نیور—''

پر یرا ہنسنے لگا۔ ہیری اور وِلی بھی مسکرا رہے تھے،'' اچھا بابا— معاف کرو۔'' پر یرا فضل جان سے جان چھڑانے کے انداز میں بولا۔ فضل جان تینوں کو 'گڈ نائٹ' کہہ کر باہر چلا گیا۔ جانے سے پہلے اپنے معمول کے مطابق یہ تاکید کرنا نہیں بھولا،'' سونے سے قبل اپنے اپنے بیڈ روم اندر سے ضرور بند کرنا— کھڑکیاں بند کر کے پردے برابر کر دینا''۔ فضل جان کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا ہو گا جو بات چیت اس نے کی ہے، وہ آخری بات چیت ثابت ہو سکتی ہے— اس کا یہ بھی دستور تھا کہ ڈنر میز پر لگا کر وہ صرف گھنٹی بجاتا اور چپ چاپ رخصت ہو جاتا۔ وہ خود ہی پیتے پلاتے، ڈنر کھاتے، سگار سگریٹ پیتے، باتیں کرتے، گاتے بجاتے، کبھی کبھار ناچتے، ایک دوسرے کو گالیاں بکتے، شور مچاتے۔ پر یرا کبھی چیخ چیخ کر روتا بھی تھا۔ پھر ایک ایک کر کے اپنے اپنے بیڈ روم کی جانب روانہ ہو جاتے۔

رات آئی، موسم کو بھی تبدیل کر لائی، آسمان مہربان ہو گیا۔ فضا سازگار ہو گئی، ہوا خوش گوار ہو گئی۔ بہت دنوں بعد اس کے ہاتھوں نے لباس کے اندر سے ایک بنسری برآمد کی، بنسری کی آواز ریسٹ ہاؤس کے سرونٹ کوارٹر سے باہر نکلی، آس پاس کے کچے پکے، پتھریلے مکانوں اور پیڑوں کو اپنے اسرار میں لپیٹتی ہوئی وادی کی فضاؤں میں سرایت کرتی، دور و نزدیک پہاڑیوں کو چھوتی، آسمان کی بلندیوں میں

پھیل گئی۔ فضل جان بانسری بجا رہا تھا اور اس کا دل گا رہا تھا۔ اِک ایسا گیت جس کو اس کے اندر کے وجود نے خلق کیا تھا، لفظوں کے بغیر، اس کے دل نے گایا، لفظوں کے بغیر — فضل جان جو بھی تھا، جیسا بھی تھا، پہاڑی تھا اور پہاڑی لفظوں کے محتاج نہیں ہوتے۔ پھر اس کی بنسری چپ ہو گئی۔ فضل جان کا بے لفظ گیت — بے آواز بھی ہو گیا لیکن بے آواز ہو کر بھی جاری رہا۔ آواز اور سُر کو موت نہیں۔ آواز اور سُر کا اَنت نہیں۔ وہ امر ہے۔ بے آواز لفظ بھی بے اَنت ہے۔ فضل جان چپ تھا۔ دن چاہے اس کا نہ ہو۔ لیکن رات اس کی اپنی تھی۔ رات جو اس کی مانند پُر اسرار تھی۔ کیا رات کی بھی ذاتی زندگی نہیں ہوتی۔ فضل جان کی طرح — ''ذاتی زندگی — ہونھ — مجھے تو یہ معلوم نہیں کہ میری کوئی زندگی بھی ہے۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا — بلند آواز میں خود ہی اپنی آواز سنی۔ اس کی آواز اور الفاظ اس کے وجود سے باہر اپنے لمبے سفر پر نکل گئے۔

جب فضل جان آؤٹ ہاؤس کی اس کوٹھری میں داخل ہوا جو اس کا بیڈ روم تھی تو اس کی چھٹی حس جو ہر پہاڑی کو قدرت سے ودیعت ہوتی ہے، اس سے بولی، تم کہاں سونے جا رہے ہو فضل جان۔ اس کوٹھری میں تمہارے علاوہ کوئی اور بھی ہے؟ اس کا بدن فوری طور پر چیتے کے بدن میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے جسم کا ایک ایک مسام جیسے دیکھنے، سننے اور محسوس کرنے لگا۔ اس نے ایک عورت کو کوٹھری کے ایک کونے میں کھڑا ہوا پایا — وہ سر سے پیر تک سفید کپڑوں میں ملبوس تھی اور بڑی سی چادر جس نے اس کے بدن کو ڈھانکا ہوا تھا، سفید رنگ کی تھی۔ اس کے بائیں بازو میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ بچے کے کپڑے بھی چٹے سفید تھے، جیسے کفن میں لپٹا ہو — ''مائی تو کون ہے اور یہاں کیا کر رہی ہے؟'' فضل جان نے غیر معمولی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے عورت سے سوال کیا۔ فضل جان نے دیکھ لیا تھا کہ عورت کے داہنے ہاتھ میں پستول تھا، جس کی نالی اس کے سر کا نشانہ لے رہی تھی۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ وہ ہاتھ کسی معمولی عورت کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ کسی شاطر نشانہ باز کا ہاتھ تھا۔ گھوڑا کھنچا ہوا تھا اور گولی نکلنے کے لئے تیار تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو فضل جان عورت سے سوال بعد میں کرتا۔ پہلے اپنا پستول نکال کر اس کو قابو میں کرتا۔

''تو مجھے نہیں جانتا؟ تیرے مالکوں سے میں ملاقات کر چکی ہوں۔ ان لوگوں نے میرے بارے میں تجھے نہیں بتایا؟'' عورت نے فضل جان سے الٹا سوال کر دیا۔

''ان لوگوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔'' فضل جان نے جواب دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ عورت اس خوف سے واقف نہ ہو جائے جو فضل جان کی ریڑھ کی ہڈی میں سما رہا تھا۔ اس نے ماحول کو مزید بے خوف بنانے کے لئے عورت کو بیٹھ کر بات کرنے کو کہا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر وہ کوئی بات کرنا چاہتی ہے تو پستول دور کر دے اور آرام سے بات کرے۔ عورت کی آنکھوں میں اور چہرے پر لحظہ بھر کے لئے ایک قہر آلود تبسم آیا اور چلا گیا۔ ''کان کھول کر سن، یہ پستول اسی طرح تجھ کو نشانے پر لئے رہے گا۔ پہلے تو یہ بتا ان لوگوں نے میرے بارے میں کیا بات کی؟'' عورت نے کرخت اور قطعی غیر نسوانی لہجے میں، ڈپٹ کر پوچھا۔ فضل جان اب اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ اس کا سابقہ انتہائی سفاک اور خطرناک عورت سے ہے۔ اس نے اپنے آپ کو حکم کا بندہ ثابت کرنے ہی میں اپنی بھلائی محسوس کی اور بولا ''وہ تیرے بارے میں یہ کہہ رہے تھے، تو اس بچے کی کہانی دنیا تک پہنچانا چاہتی ہے، ان کے واسطے سے۔''

''سچ ہی کہہ رہے تھے، وہ پسران خنزیر۔'' عوت نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔

''اس بچے کی کہانی— کیا کہانی ہے اس بچے کی؟'' فضل جان مجسم سوال بن گیا تھا۔

''میں نے ان سے یہی کہا تھا— میں عورت ہوں اس لئے میرا معاملہ پردے ہی میں ٹھیک ہے، مگر اس بچے کی کہانی سوچی دنیا تک پہنچنی ضروری ہے— '' عورت بولی۔

''اگر اس بچے کی کوئی کہانی ہے تو اسے میں بھی دنیا تک پہنچا دوں گا۔ ان فرنگیوں کی کیا ضرورت ہے؟'' فضل جان عورت کو رام کرنے میں لگا ہوا تھا۔ یوں ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے عورت کا مسئلہ اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، لیکن عورت کے چہرے کی وحشت اور خشونت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو رہی تھی۔

''کیا کہا تو نے— تو پہنچائے گا اس بچے کی کہانی دنیا تک؟ بیوقوف آدمی! دنیا کو میری اور اس بچے کی کہانی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ دنیا کو لاشوں کی ضرورت ہے— اور لاشیں— لاشیں— سمجھا تو— ؟'' عورت کی گھٹی گھٹی آواز مزید خوفناک ہو گئی تھی، جیسے دانت پیس رہی ہو۔

''مائی— تو پاگل ہو گئی ہے— ہوش میں آجا۔'' فضل جان نے انتہائی لجاجت سے کہا۔ ''ہاں، ہاں میں پاگل ہو گئی ہوں کیونکہ میں ماں ہوں اس بچے کی جو میرے بدن سے لپٹا ہوا ہے۔ میں ان تمام بچوں کی ماں ہوں جن کے سرپرست میرے علاقے میں مارے گئے۔ میں ان علاقوں کی مٹی ہوں، زمین ہوں، مجھ پر بم برسائے گئے، مجھ پر جنگ مسلط کی گئی۔ میرے بدن پر، میری چھاتی پر، میرے شکم پر غیروں نے اپنے فوجی بوٹ رکھے میری عزت روندی گئی— تو! تو پاگل کیوں نہ ہو گیا۔ تو بھی اس مٹی سے اُگا ہے۔ کیا تو بے حمیت اور بے غیرت ہے۔'' عورت نے فضل جان پر لفظوں کی باڑھ ماری۔ وہ تھرا کر رہ گیا۔ ''اگر تو بھی اسی زمین کا فرزند ہے تو سن! میں سرحد کے اُس پار سے ان کے پیچھے ہوں۔ مجھے ان کی لاشیں دنیا کو بھیجنی ہیں۔''

''مائی— تجھے کیا ہو گیا ہے؟ تو سمجھتی کیوں نہیں؟ یہ مردوں کے معاملات ہیں، جنگ اور امن کے معاملات۔ تم عورتوں کو گھروں میں بیٹھ کر دعائیں مانگنا ہے— امن کی— خوشحالی کی— '' فضل جان پیار اور شفقت بھرے لہجے میں بولا۔

''کیا کہا تو نے؟ گھروں میں بیٹھنا ہے— دعائیں مانگنی ہیں— گھر— کیسے گھر؟ گھر تو آئے دن بمباری کی زد میں آجاتے ہیں۔ اللہ کے گھر بھی محفوظ نہیں۔ مجھے تیرا جواب چاہیے۔ صاف صاف— تو— ان لوگوں کا صفایا کرے گا— یا— نہیں— ''

''مائی— میں مجبور ہوں— میں ان کو نہیں مار سکتا۔ یہ میرے ایمان کے خلاف ہے۔ میں نے ان تینوں سے معاہدہ کیا ہوا ہے— ان کی رہبری کا— ان کا خیال رکھنے کا۔'' فضل جان نے اب کی مرتبہ دوٹوک بات کر دی۔

''تو کیسا آدمی ہے؟ تجھے نہ تو اپنی مٹی کا پاس ہے اور نہ اپنے دین کا؟'' عورت نے اس کو طعنہ دیا۔

''میں اپنے معاہدے کا پابند ہوں۔'' فضل جان نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا۔

''مجھے تجھ پر ترس آرہا ہے۔ اس لئے تجھے نہیں ماروں گی— اپنی قمیص اوپر کر کے کھڑا ہو جا— فضل نے اپنی قمیص اوپر کی اور سیدھا کھڑا

ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ عورت اس کے باز و الٹی ہوئی قمیص میں پھنسائے گی — عورت نے ایسا ہی کیا اور کوٹھری سے باہر نکل گئی۔ کوٹھری کا دروازہ بھی بند کر دیا۔

عورت کے باہر نکلتے ہی فضل جان اپنی قمیص کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش میں لگ گیا۔ وہ عورت ان معاملات کی ماہر معلوم ہوتی تھی۔ اس سبب سے فضل جان اس پر قابو نہ پا سکا، جس وقت تک وہ آزاد ہوا بڑی دیر ہو چکی تھی۔ اس دوران تصور کی آنکھوں سے اس نے ان تینوں باہر والوں کو طرح طرح سے مرتے ہوئے دیکھا لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے گولیوں کے چلنے کی آوازیں حقیقت میں سنی تھیں۔ تصورات کی جیسی یورش سے وہ گزر رہا تھا اس میں بہت کچھ وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ قمیص کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑانے کے بعد، دروازے کے کواڑوں سے اپنے حواس لگا کر پہلے باہر کی سن گن لی۔ جب اُسے اطمینان ہو گیا کہ باہر صرف اور صرف سناٹا ہے تو اس نے اُن قدیمی کواڑوں سے زور آزمائی شروع کی۔ کواڑ پرانے ضرور تھے، لیکن تھے اس علاقے کی لکڑی کے۔ آؤٹ ہاؤس کے کواڑوں کے لئے کوئی بیوقوف ٹھیکے دار ہی فینسی لکڑی استعمال کرے گا۔ زور لگانے پر بھی وہ اتنے نہیں کھلے کہ وہ اپنا جسم باہر نکال لیتا۔ بڑی مشکل سے وہ اپنا باز و باہر کرنے میں کامیاب ہوا، لیکن لاکھ کوشش کے باوجود اس کا ہاتھ کنڈی تک نہ پہنچ سکا اور نہ ہی کواڑوں کی درمیانی دراڑ اتنی بڑھی کہ اس کا سر باہر نکل سکتا۔ وہ جانتا تھا کہ بندہ اپنا سر نکالنے میں کامیاب ہو جائے تو سمجھو بدن بھی نکال لے گا۔ تھک ہار کر وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر ستا کر وہ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس مرتبہ اس نے دروازہ توڑنے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا، لیکن جب اس نے دروازے کو دھکا دیا تو دونوں کواڑ جھٹ پٹ کھل گئے۔ کسی نے باہر لگی ہوئی کنڈی کھول دی تھی۔ وہ دروازے سے اس طرح نکلا جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے۔ باہر نکلتے ہی اس نے پستول نکال لیا تھا۔ تقریباً دوڑتا ہوا وہ ریسٹ ہاؤس کے اندرونی علاقے میں داخل ہوا اور سیدھا بیڈ رومز کی جانب مڑ گیا۔ پہلے ہیری کی خواب گاہ پڑی تھی، اس کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ اندر سے بند نہ تھا۔ فضل جان نے ایک مرتبہ زور سے کواڑ بجائے اور اپنی مخصوص آواز میں کھنکھارا۔ اندر سے کوئی جواب نہ آنے پر اندر داخل ہو گیا۔ اندر کوئی نہ تھا۔ بستر ایسا تھا جیسے رات بھر کوئی لیٹا تک نہ ہو۔ فوراً ہی وہ ساتھ والے کمرے کی طرف بھاگا جو پریرا کا بیڈ روم تھا۔ وہاں بھی کوئی موجود نہ تھا۔ بستر بھی بے شکن تھا۔ تیسرے بیڈ روم تک جانے کے لئے ایک نیم دائرے میں گھومنا پڑتا تھا۔ کیونکہ درمیان میں زینہ پڑتا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے اور کھنکھارنے کے فرائض کی ادائیگی کے بعد وہ وِلی کے بیڈ روم میں داخل ہو گیا جو اندر سے کھلا ہوا تھا۔ اندر کا منظر دل دہلانے والا تھا۔ کمرے کی ہر چیز الٹی پلٹی پڑی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اندر زبردست مارا ماری ہوئی تھی۔ فرش پر جگہ جگہ دھبے تھے۔ شاید خون کے۔ بیڈ پر وِلی مادرزاد برہنہ پڑا تھا۔ فضل جان دوڑ کر پہلے وِلی کی طرف گیا۔ اس کی نبض دیکھی، سانس چیک کی اور سینے پر کان رکھ کر دل کی آواز سنی۔ وِلی مر چکا تھا۔ وِلی کے بعد باری باری اس نے ہیری اور پریرا کے بدن دیکھے جو کمرے کے فرش پر پڑے تھے۔ وہ دونوں بھی دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ فضل جان جب اس خونی خواب گاہ سے باہر نکلا تو وہ سوچ کچھ رہا تھا اور عمل کچھ کر رہا تھا۔ عملاً وہ مطابق حالات ضروری اقدامات میں مصروف تھا، لیکن اس کا ذہن حالات کی تہہ تک جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بعد بطور احتیاط اس نے ہیری اور پریرا کے کمرہ ہائے خواب باہر سے بند کئے اور ریسٹ ہاؤس میں موجود ہر کسی کو چوکیدار سمیت واقعہ سے آگاہ کیا — پھر کسی نہ کسی صورت پولس اور علاقے کے اعلیٰ حکام تک اس سانحے کی اطلاع پہنچوائی اور اس پر جو مصائب ٹوٹنے والے ہیں، ان کا خیال کرنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ آنے والا وقت اس کے لئے بڑا ہی کٹھن ہوگا۔ وہ بڑی سخت اور خوفناک

الجھنوں میں پھنس چکا تھا۔اس کو اپنی گرفتاری بھی یقینی نظر آ رہی تھی۔ یوں تو ان علاقوں میں انسانی جانوں کی کوئی قیمت نہیں تھی، لیکن یہ تین جو یہاں مارے گئے تھے، انسان نہیں تھے، فرنگی تھے۔ ''کیا وہ ان کے مرنے پر یا مارے جانے پر خوش تھا؟'' وہ جہاں دیدہ تھا، ظاہر میں بڑا کھر درا، سخت اور غیر جذباتی تھا۔اس نے موت کو روپ روپ میں دیکھا، خود بھی کئی مرتبہ مرنے سے بچا تھا۔موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال چکا تھا—اور ان تینوں پر تو اسے یہ شبہ بھی ہو گیا تھا— کہ یہ پسرانِ خنزیر کسی ایسی سرگرمی میں ملوث تھے جو اس کی مادرِ وطن کے خلاف یا سرحد کی دوسری جانب کے ملک کے خلاف کی جا رہی تھی—وہ چاہتا تھا کہ یہ لوگ جلد سے جلد یہاں سے ناکام و نامراد دفع ہو جائیں، لیکن وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ مارے جائیں۔ وہ اپنی موت کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔اس کے سیدھے سادے اسلامی عقیدے نے اس کو اس معاملے میں پکا کر دیا تھا، لیکن کسی دوسرے کی موت اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ تو کسی جانور کی موت پر بھی آبدیدہ ہو جاتا تھا اور یہ تینوں تو اس کے ذمے دار تھے۔ان لوگوں نے اس سے معاہدہ کیا ہوا تھا، وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ان کے مارے جانے پر خوش نہیں تھا لیکن اس کی آنکھوں میں نمی نہیں آئی تھی۔ شاید اسی سبب سے کہ وہ وطن دشمن تھے، جو صورتِ حال فضل جان کو درپیش تھی، اس سے ان دو سوالوں کا کوئی خاص تعلق نہیں تھا—اس کی خوشی اور اس کا دکھ دنیا کے لئے بے معنی تھے۔ وہ تو دل ہی دل میں یہ بھی محسوس کر کے دکھی ہو رہا ہے، ان تینوں کے گھروں میں—ان کے گھر والوں پر کیا گزرے گی—جب ان کی موت کی اطلاع پہنچے گی اور پھر ان کی صندوق میں بند لاشیں—اس کو ان سوچوں سے جلد سے جلد چھٹکارا پانا تھا اور پولس حکام اور دوسرے تحقیقات کرنے والوں کے درشت لہجے، سخت سوالات اور ناقابلِ قیاس مار پیٹ اور جسمانی ایذاؤں کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا تھا۔

معاملہ تین باہر والوں کے قتل تھا۔موسم بھی کچھ سازگار ہو گیا تھا۔ ہر کام جلد جلد نمٹائے گئے— پولس آئی، اعلیٰ حکام آئے، تحقیقاتی اداروں کے لوگ آئے۔ مار پیٹ وغیرہ فضل جان کی توقع سے زیادہ ہوئی ریسٹ ہاؤس کے سبھی ملازموں کو ان مصائب سے گزرنا پڑا۔ پہلے ریسٹ ہاؤس میں اور پھر پولس 'لاک اَپ' میں۔فضل جان نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔البتہ اس نے 'عورت اور بچے' کے ذکر کو ہر کسی سے مخفی رکھا۔اس کو یقینِ کامل تھا کہ کوئی بھی اس پر یقین نہیں کرے گا۔الٹا یہ خیال کیا جائے گا کہ 'فضل جان نے یہ کہانی اپنے کو بچانے کے لئے گھڑ لی ہے۔سب لوگوں کو بغیر مقدمہ چلائے بہت جلد چھوڑ دیا گیا۔البتہ فضل جان کو اس علاقے اور دونوں ممالک کی سرحدوں سے 'تڑی پار' کے احکام جاری کئے گئے۔اس کو فوری طور پر وہاں سے سرکاری طور پر منتقل کر دیا گیا—یوں بھی وہ جانتا تھا کہ اس کا ان مقامات پر پایا جانا خطرے سے خالی نہیں تھا—اگرچہ اس معاملے میں 'اصل رازوں' کو خفیہ رکھا گیا تھا پھر بھی فضل جان یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ ولی، ظاہر میں امرد اور بے ضرر بنا ہوا ولی ایک خطرناک 'ڈبل ایجنٹ' تھا جو خود بھی مارا گیا اور اپنے دونوں ساتھیوں کی موت کا بھی سبب بنا—ولی نے حالات اس قدر خراب کر دئے تھے کہ ان تینوں کو ان کے ملکوں نے اپنا شہری تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔اسی سبب سے فضل جان کو علاقہ بدر کر کے رہا کر دیا گیا اور پورے معاملے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا گیا۔

فضل جان نے اپنا نام بھی بدل لیا ہے اور پیشہ بھی۔البتہ اس کے ذہن میں یہ سوال کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا ہے۔''وہ عورت اور بچہ کیا دو کفن پوش روحیں تھیں یا انتقام کی پیاسی اور مادرِ وطن کی محبت میں سرشار ایک زندہ عورت، اپنے یا کسی اور کے مظلوم بچے کو سینے سے لپٹائے ہوئے—؟''

☆☆☆

......چور......

چور نے کروٹ بدلی۔ دو تین جماہیاں لے کر وہ بستر سے اٹھ گیا۔ دونوں بازو اٹھا کر ایک انگڑائی لی۔ جلدی جلدی یوگا، جوڈو کراٹے کے اپنے پسندیدہ آسن کیئے۔ چہرے اور خاص طور پر آنکھوں پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ گھڑی دیکھی رات کے تین بج چکے تھے۔ وہ تین بجے سے پہلے چوری کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ اس کے تجربے اور مشاہدے کے مطابق یہی وہ وقت ہوتا ہے جب راستے میں کسی سے مڈبھیڑ ہونے کے کم سے کم امکان ہوتے ہیں۔ پولیس کے گشتی سپاہی بھی اس وقت نظر نہیں آتے۔ جوئے خانوں، شراب خانوں، رقص گاہوں اور قہوہ خانوں کے شوقین بھی یا تو اس وقت سے پہلے یا اس کے گھنٹے دو گھنٹے بعد ہی سڑکوں اور گلیوں میں دکھائی دیتے۔ گاڑیاں، کاریں، ٹیکسیاں قریب قریب ناپید ہو جاتی ہیں اور تو اور گلیوں کے آوارہ کتے بھی ستاتے ہوتے ہیں۔ چور نے ریوالور، چھری اور دوسرا ضروری سامان اپنے کپڑوں میں مخصوص جگہوں پر پیشہ ورانہ ہنرمندی سے پوشیدہ کیا اور باہر گلی میں نکل گیا۔ باہر نکلنے سے قبل ہی وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کو اپنی جائے واردات تک پیدل ہی جانا ہے۔ جیسے ہی وہ آگے بڑھا تو اس نے دیکھا چوری اس کے آگے چل رہی تھی۔ یہ معمول کی بات تھی۔ ہمیشہ وہ اور چوری اسی طرح موقع واردات تک پہنچتے۔ کسی سواری میں ہوں یا پیدل ان کا سفر اسی طرح طے ہوتا چور پیچھے اور چوری آگے۔ اس رات ایک غیر معمولی بات ہوئی۔ اچانک چوری نے خلافِ معمول حرکات شروع کر دیں۔ کبھی وہ اس کے دائیں پہلو میں آ جاتی، کبھی بائیں، کبھی اس کے سر پر سوار ہو جاتی تو کبھی اس کی پشت پر آ جاتی۔ پھر اتر کر اس کے پیچھے چلنے لگتی۔ چور اس صورت حال کے لیے تیار نہ تھا اس کے بچپن کی پہلی چوری سے لے کر اس رات تک وہ چوری کے پیچھے چل کر چوری کرتا آیا تھا۔ وہی اس کی راہبر، رہنما اور پیشوا تھی۔ کبھی تو یوں لگتا چوری اس کی مالک اور آقا تھی۔ اور وہ اس کا غلام، جب وہ وہ چوری کے لیے نکلتا تو وہ اس کے آگے چلنے لگتی اور پھر جو وہ کچھ بھی کرتا اس کے اشارے پر کرتا۔ وہی اس کو اتنا مستعد، پھرتیلا اور چالاک بنا دیتی کہ خود وہ بھی حیران رہ جاتا۔ انتہائی مشکل سے مشکل مرحلوں پر اس نے جس ذہانت اور پھرتیلے پن کا مظاہرہ کیا وہ ہرگز ہرگز اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ کبھی کبھی تو خود اسے بھی یقین ہو گیا تھا کہ نہ صرف وہ اپنی مہم میں ناکام ہونے والا ہے بلکہ اس کا پکڑا جانا بھی لازم ہے۔ لیکن چوری نے ان کڑے مرحلوں پر اس کی ہمت بڑھائی اس کے اندر شیر کی طاقت، چیتے کی ذہانت اور ہاتھی کی ہمت پیدا کر دی۔ اس کی رگوں میں بجلی دوڑا دی۔ اعضا کو مشینی سبک رفتاری اور ذہن کو کمپیوٹر رانہ سریع الفکری بخش دی۔ نتیجے کے طور پر نہ صرف وہ اپنی واردات میں کامیاب ہو گیا۔ بلکہ گرفتاری سے بھی محفوظ رہا اور آج تک چوری کے الزام میں گرفتار نہیں ہوا۔ چار چھ مرتبہ پولیس کے ہتھے چڑھا بھی کچھ گھنٹوں اور ایک مرتبہ ایک دن ایک رات حوالات میں بند بھی رہا لیکن چوری کے سلسلے میں نہیں بلکہ دوسرے فضول اور لغو معاملات میں جیسے شراب پیکر غل غپارہ کرنا، کسی امیر کبیر کے لڑکے کو راہ چلتی لڑکی پر دست درازی سے روکنے اور نہ ماننے پر اس کی قدرے زیادہ پٹائی کرنا اور ایک عوام سے پر فریب جھوٹے وعدے کرنے والے سیاسی لیڈر کے

انتخابی جلسے میں گڑ بڑ پھیلانا وغیرہ وغیرہ۔اس کی زندگی میں چوری کی حیثیت ایک (Motivator) محرک کے ساتھ (Protector) محافظ کی بھی تھی۔اس کو ایک روبوٹ فرض کر لیں تو چوری کا کام اس کی ہر واردات کی پروگرامنگ کرنا تو تھا ہی لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک طرح کے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے حالات وواقعات کی خلاف توقع تبدیلی کے مطابق روبوٹ کو فعال بنانا اوراسی طرح کسی بھی ناگہانی آفت سے اس کو بچالینا۔اگراس کی مہم کو خلائی سفر سے تعبیر کیا جائے تو چوری ہی راکٹ اور چوری ہی اس کی خلائی شٹل تھی۔اس کو اپنا چوری کرنا تو یاد ہے،پہلی چوری سے لے کراس کو قریب قریب اپنی ساری چوریاں یاد ہیں اوراگر یاد بھی نہ ہوں تو یاد کرنے پر ضرور یاد آجائیں گی۔لیکن اس کو یہ یاد نہیں ہے کہ چوری ایک وجود کے طور پر اس کی آنکھوں کے سامنے پہلے پہل کب (VISUALISE) ظاہر ہوئی تھی۔وہ چور ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پڑھنے لکھنے والا تو نہیں البتہ پڑھا لکھا آدمی تھا انگریزی شاعری کی کلاس کے ڈرامے 'میکبیتھ' میں جب خاتون لیکچرار نے 'خنجر' کے بارے میں بحث کی تو اس بحث میں اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔اس کا یہ خیال تھا کہ 'خنجر' ایک حقیقی وجود کے طور پر سامنے آیا تھا نہ کہ محض ایک Illusion کے طور پر۔چوری کو وہ ایک حقیقی وجود کے طور پر مانتا تھا۔چوری اس کے اندر سے باہر آئی یا باہر سے اس کے اندر داخل ہوئی اس مسئلے کے بارے میں اس کا ذہن صاف نہیں تھا البتہ اس کا مشاہدہ تھا کہ جب وہ چوری کے لیے چلتا تو چوری اس کے آگے آگے ہوتی۔اور جب وہ چوری کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ اس کے اندر چلی جاتی اوراس کے اپنے وجود کا حصہ بن اجاتی۔اس رات چوری نے جو رویہ اختیار کیا تھا اس سے وہ اس قدر پریشان ہو گیا تھا کہ چوری کی مہم پر آگے بڑھنا اس کے بس کی بات نہیں رہی۔اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔وہ راستے کی بائیں جانب پیدل چلنے والوں کی پٹی پر چل رہا تھا۔یوں تو وہ چوری کی مہم کے دوران بڑے رسان سے قدم بڑھانے کا عادی تھا لیکن اس رات وہ کچھ اس طرح بوکھلایا ہوا تھا کہ اس نے ایک دوکان کے شٹر سے لگ کر سوئے ہوئے گانے والے بھکاری کے بدن پر پیر رکھ دیا حالانکہ وہ اس بھکاری کے سونے کے اڈے سے بخوبی واقف تھا اور یہ بھی جانتا ہے کہ وہ ایک بیگ کے اندر گھس کر سوتا ہے بھکاری بڑبڑا کر اٹھا ساز ہاتھ سے چھو کر تسلی کی کہ وہ اپنی جگہ بحفاظت ہے اور پھر سو گیا۔ان لوگوں کے لیے ان کا ساز ان کی جان سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔جس طرح الف لیلوی کہانیوں میں جادوگروں کے بادشاہ کی جان کسی طوطے میں ہوتی ہے ان بھکاریوں کی جان ان کے کسی اکلوتے ساز میں ہوتی ہے۔بہرحال چوراس پر پیر رکھ کر بے حد دکھی ہو گیا۔اس کے خیال میں اس کا یہ جرم ناقابل معافی تھا۔وہ صاف طور پر محسوس کر رہا تھا کہ وہ ہوش میں نہیں تھا۔قریب قریب باؤلا سا ہو رہا تھا۔اس نے شاید یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کی ذہنی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ چوری جیسا پیشہ وارانہ مہارت کا کام انجام دے۔چلتے چلتے وہ ایک گلی کے ایک آوارہ کتے پر پیر رکھتے رکھتے سنبھل گیا ورنہ وہ مشکل میں پڑ سکتا تھا۔کتا پہلے کیں کیں کرتے ہوئے بھاگتا لیکن جیسے ہی اس کی حیوانی بلکہ سگ جبلّت اس کو آگاہ کر دیتی کہ مقابل اس سے خائف ہے تو وہ شیر ہو جاتا،عین ممکن ہے اس پر دھاوا بول دیتا،یا کم از کم اس کو حرکت کرنے پر پابندی لگا دیتا۔کچھ دور اور چل کر اس نے یہ دیکھنا چاہا مبادا''چوری''اس کے آگے چلنے لگے لیکن اس کی خوش فہمی خیال خام ثابت ہوئی۔اب تو چوری نے اپنی خلاف توقع حرکات سے بھی ہاتھ اٹھا لیا تھا۔وہ سرے سے غائب تھی۔نہ دائیں بائیں اور نہ ہی عقب میں۔اس نے اپنی ساری توجہ اپنے اندر کی جانب کر کے یہ دیکھنا چاہا کہ وہ اس کے اندر تو نہیں چلی گئی لیکن اس کا اندر بھی''چوری''کے وجود سے خالی تھا۔اب اس کے سامنے

کوئی Target بھی نہ تھا۔اس نے سوچا اب اسے لوٹ جانا چاہئے لیکن وہ آگے ہی آگے چلتا رہا۔بے مقصد۔اچانک اس کی ٹانگیں تھکنے لگیں۔سامنے ہی ایک پارک تھا۔غیر ارادی طور پر اس کے قدم پارک کے سامنے لگی ہوئی ایک بنچ کی جانب بڑھ گئے اور چند منٹ بعد وہ اس بنچ پر بیٹھ چکا تھا۔یہ اسکے لیے اچھی بات تھی کہ موسم سرد نہیں تھا اور نہ ہی Windy۔بنچ پر بیٹھ کر اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔وہ چاہتا تھا کہ اس کا ذہن کم از کم تھوڑی دیر کے لئے بالکل خالی ہو جائے۔لیکن ایسا ہونا اتنا آسان نہیں تھا۔انسانی ذہن یوں جلدی جلدی ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی جانب رجوع ہونے کی صلاحیت کا حامل ہے لیکن کوئی کوئی خیال ذہن سے یوں چپک جاتا ہے کہ دوسرے کسی خیال کو نزدیک پھٹکنے تک نہیں دیتا۔بنچ پر بیٹھے ہوئے چور نے اپنی بے بسی کو محسوس کر لیا۔نہ تو ''چوری'' اس کے پاس آ رہی تھی نہ ہی اس کا ذہن 'چوری' سے دور جانے کے لیے تیار تھا۔ان ہی لمحات میں اس کے دل میں خوف کی ایک ٹھنڈی لہر اٹھی کہ شاید 'چوری' اب کبھی اس کے پاس نہیں آئے گی۔وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ گئی ہے۔اس نے اپنے پانچوں حواس کی مدد سے اپنے چاروں جانب بلکہ دور دور تک 'چوری' کو محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن ''چوری'' کا کہیں پتا نہ تھا۔اس خیال سے اس کو شدید صدمہ ہوا کہ چوری کے بغیر ہی اس کو اپنی مہمات سر کرنی پڑیں گی۔کیا وہ ایسا کر سکے گا۔وہ ایک کامیاب چور تھا۔اسے اپنے آپ پر ناز تھا۔اس کو یقین تھا کہ اس میدان میں اس کا کوئی مد مقابل نہیں تھا۔وہ ایک بے مثال چور تھا اور اس کو ایک بے مثال چور بنانے میں ''چوری'' کا ہاتھ تھا۔جو اب اس سے روٹھ گئی تھی۔چور نے بنچ کو خیر باد کہا اور مایوس لوگوں کے بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ شفا خانے یعنی دوسرے لفظوں میں شراب خانے (Bar) کی جانب اس کے قدم بڑھنے لگے۔دارو کے سستے اڈے رات کے آخری پہروں تک کھلے نہیں رہتے۔اس سے پہلے کہ وہ شراب خانے پہنچتا، اس کے قدم خود بہ خود ایک مقام پر رک گئے اور وہ ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کے احاطے (Entarance) میں داخل ہو گیا۔وہ اندر سے بند تھا۔یہ توقع فضول تھی کہ اس بلڈنگ کا کوئی مکین اندر سے باہر آئے یا باہر سے اندر تو وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر اندر داخل ہو جائے۔چنانچہ پاس ہی لگے فون پر کوڈ نمبر ملائے، مطلوبہ اپارٹمنٹ میں گھنٹی بجی اور کسی خاتون کی آواز آئی 'کون ہے؟' اپارٹمنٹ والی خاتون نے اسے آواز سے شناخت کر لیا اور بولی ''ساری رانگ نمبر!'' اس کا مطلب یہ تھا کہ خاتون کسی کے ساتھ مصروف تھیں۔چور الٹے قدموں باہر آ گیا اس نے سوچا تھا اپنی مایوسی کو اس خاتون کی جسمانی رفاقت کی مدد سے دور کر دے۔جس طرح وہ ایک بے مثال چور تھا۔چور کی نظروں میں وہ خاتون لوگوں کی مایوسیوں، اداسیوں محرومیوں اور ناکامیوں کا علاج کرنے میں بے مثال تھیں۔اس کا واسطہ ٹین ایجر لڑکیوں سے لے کر پختہ عمر تک قریبا ہر عمر کی بے شمار عام پیشہ ور اور خانگی بے بیوں (Babies) سے پڑ چکا تھا لیکن ان خاتون کی بات ہی اور تھی۔بدن الھڑ بالکاؤں کا، طور طریقہ اور Grace بالغ مزاج دلربا ؤں کا، لٹنے میں لوٹنے کا انداز۔اپنی تکمیل کو یوں تو اس قماش کی سبھی عورتیں (Fake) کرتی ہیں لیکن اس کا اندازہ ایسا ہوتا کہ جیسے دریچے کے راستے کمرے میں داخل ہو کر دھمال کرنے والی آندھی اپنے رقص کے عروج پر پہنچ کر تھک کر بیٹھ جائے۔عیش ونشاط کے جس مرحلہ تکمیل تک یہ خاتون پہنچا دیتی تھی۔دنیا کی شاید ہی کوئی شریف یا غیر شریف خاتون پہنچاتی ہو۔اس اپارٹمنٹ بلڈنگ سے نکلنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کی دنیا کچھ زیادہ تاریک ہو گئی ہے۔یہ تاریکی اس رات کی تاریکی کے مماثل تھی۔جس رات اس کی ماں اس کو ایک سپر مارکیٹ میں چھوڑ کر اپنے نئے خاوند کے ساتھ فرار ہو گئی تھی اس وقت اس کی عمر بارہ برس کے

قریب تھی اس کے بعد اس کی ماں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اس عمر میں بھی اس نے حالات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرلیا تھا اس نتیجے پر پہنچنے میں اسے دیر نہیں لگی کہ دونوں نے ملی بھگت سے یہ فیصلہ کیا ہوگا کہ اس کو بازار کی گہما گہمی میں ایک بنچ پر چھوڑ کر فرار ہو جایا جائے۔ چند دنوں سے اس کی ماں گھر کی چیزوں کو اس طرح سمیٹ رہی تھی جیسے وہ لوگ کسی اور شہر جانے والے ہوں لیکن وہ یہ کیسے سوچ سکتا تھا کہ وہ لوگ اس کو چھوڑ جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور وہ بھی بازار میں۔ اس کو شک سا ہوا کہ انہوں نے اپارٹمنٹ چھوڑ دیا ہوگا اس کو اپارٹمنٹ جانے میں بڑی مشکل ہوئی لیکن وہ کسی طرح پہنچ گیا۔ دروازہ مقفل تھا جینیٹر نے چابی دینے سے انکار کر دیا البتہ اس کی کتابیں، اسکول کا دوسرا سامان کچھ کپڑے وغیرہ ایک بنڈل کی صورت میں اسے دیئے جو اس کی ماں اس کے لیے چھوڑ گئی تھی اور ہاں ایک چھوٹا سا لفافہ جس میں ایک ایک ڈالر کے دس نوٹ تھے ایک مختصر تحریر کے ساتھ "Sonny!Have fun Your, mom" بیٹے مزے کرو۔ تمہاری ممی"۔ اس بنڈل اور تحریر نے اس کی دنیا کو تاریک کر دیا لیکن اس نے اپنے آنسو بھی روک لیے۔ جینیٹر نے اسے مشورہ دیا کہ وائی ایم سی اے والوں سے اپنی رہائش کے لیے درخواست کرے۔ پتہ بھی سمجھایا لیکن ایک رات سونے کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں دی۔ وہ تاریکی رات میں ایک ایسے مستقبل کی طرف چل پڑا جو گہری تاریک میں ملفوف تھا اور جس کا اسے رمق برابر بھی اندازہ نہیں تھا۔ اس رات کی تاریخ کو وہ کبھی بھی بھول نہیں سکا۔ اس رات وہ چلتا رہا۔ یوں لگتا تھا کہ آدمی کی جگہ وہ روبوٹ ہے جس کا پروگرام 'چلتے رہنا ہے'۔ چلتے چلتے وہ کسی طرح اپنے سگے باپ کے گھر پہنچ گیا خود اس کو معلوم نہیں ہو سکا جب وہ عین اس گلی میں پہنچ گیا جہاں اس کا باپ رہتا تھا تب اس کو اس بات کا احساس ہوا۔ اس نے ڈور بل بجائی۔ جس خاتون نے دروازہ کھولا وہ اس کے سگے باپ کی موجودہ بیوی تھی۔ اس نے اپنا تعارف کرایا اور خاموش کھڑا رہا۔ وہ خاتون بھی کچھ لمحے کے لیے گم سم کھڑی رہی پھر اس کو انتظار کرنے کا کہہ کر اندر چلی گئی۔ البتہ دروازہ بند کرنا نہیں بھولی۔ کچھ دیر بعد جب ایک بار پھر دروازہ کھلا تو اس کا باپ اس کے سامنے تھا۔ "تم۔تم کیسے آئے" اس نے تجسس اور ناپسندیدگی کے ملے جلے لہجے میں سوال کیا۔ "ہاں میں آ گیا ہوں" چور نے جواب دیا اور اپنے باپ پر نظریں گاڑ دیں۔ ان نظروں میں التجا تھی، توقع تھی، یا درخواست۔ اس کو یاد نہیں رہا۔

"تمہاری ماں نے تمہیں یہاں کس طرح بھیج دیا۔"

"میں خود آیا ہوں۔"

"کیوں کس لیے۔ کیا اس نے تمہیں گھر سے نکال دیا ہے یا تم گھر سے بھاگ کر آئے ہو، اس نے اس سے پہلے تو تمہیں کبھی آنے نہیں دیا۔ اس نے تو کورٹ کی مدد سے تمہیں حاصل کیا تھا۔"

"وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔"

"اچھا تو وہ اپنے دھگڑے کے ساتھ بھاگ گئی۔ کتیا۔"

اگر چہ میری ماں نے مجھ سے دغا کی تھی لیکن مجھے اس کے بارے میں کتیا کا لفظ بہت برا لگا اور خاص طور پر باپ کی زبان سے لیکن میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور چپ چاپ کھڑا رہا۔ کچھ دیر سکوت طاری رہا گھر کا دروازہ قدرے کھلا ہوا تھا۔ شاید اس کے باپ کی بیوی ان لوگوں کی باتیں سن رہی تھی۔ باپ کو اس کا احساس نہیں تھا۔ کچھ دیر کھڑے کھڑے پہلو بدلنے اور دو تین مرتبہ سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے

کے بعد اس کے باپ نے جو کچھ کہا وہ چور کی سماعت میں خنجر کی طرح اتر گیا اور زندگی بھر کے لیے پیوست رہ گیا۔

''دیکھو بیٹے میرے گھر میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہمارا گھر بہت چھوٹا ہے اور ہمارے ساتھ ہماری دو بچیاں بھی رہتی ہیں۔ مناسب یہی ہوگا کہ تم کہیں اور چلے جاؤ۔ ہم تمہیں خوش آمدید نہیں کہہ سکتے۔ خدا حافظ شب بخیر!''

عین اس وقت دروازہ کھلا اور وہ خاتون جو دروازے کے عقب سے ہماری باتیں سن رہی تھی اچانک باہر آ گئی اس نے میرے باپ کے بازو کو چھوا اور بولی ''نہیں ہیری یہ بہت چھوٹا ہے اور رات کا وقت ہے اس کو گھر کے اندر لے چلو، کھانا دو کل اس کے بارے میں کچھ فیصلہ کریں گے۔'' میرے باپ نے اس کو جھڑک دیا اور بولا۔ ''نہیں—— ہنی تم اس معاملے میں نہ پڑو۔ میں نے فیصلہ سنا دیا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑا اور گھسیٹ کر اندر لے گیا۔ دروازہ آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ رات اور زیادہ تاریک ہو گئی۔ چور دل میں غصہ اور آنکھوں میں آنسو لیے آگے چل پڑا۔ جب باپ اس خاتون کو اندر گھسیٹ کر لے جا رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں جو کچھ تھا اس کو برسوں کے بعد Revisualise کر کے پہچانا تھا۔ ان آنکھوں میں جو کچھ تھا اس کو وہ مامتا کا نام دینے پر مجبور تھا کبھی کبھی وہ سوچتا کہ وہ اس کی سگی ماں نہیں تھی اور اس کی اپنی دو سگی بچیاں بھی تھیں لیکن اس کی آنکھوں میں اس رات مامتا جھلک رہی تھی۔ وہ آج بھی اس کی قسم کھا سکتا تھا۔ وہ رات ''بڑی تبدیلیاں لانے والی'' رات تھی۔ اس رات نے اس کی آئندہ زندگی کا فیصلہ لکھ دیا۔ شاید اسی رات جب اس کی ماں نے اس کا ساتھ چھوڑا اور اس کے سگے باپ نے اس پر اپنے گھر کا دروازہ بند کیا تو 'چوری' اس کے ساتھ ہو گئی۔ اس رات 'چوری' باہر سے اس کے پاس آئی تھی یا اندر سے نکلی تھی یہ آج تک اس پر واضح نہیں ہو سکا تھا۔ 'چوری' کے بغیر اس دنیا میں وہ ایک بار پھر اکیلا رہ گیا تھا۔ جب وہ اس دلربا خاتون کی اپارٹمنٹ بلڈنگ سے نکلا تو اس کے سامنے اس کی منزل ایک بار پھر تھی جو کیسینو بھی تھا، ڈسکو کلب بھی تھا، اور بار بھی۔ وہاں نیم برہنہ بلکہ قریب قریب برہنہ لڑکیاں جھولوں میں جھول کر یا رقص + جمناسٹک کی حرکات کے ذریعہ اپنے ''وائٹل ڈائی من شنس'' اور لم ٹنگی کی نمائش کرتیں۔ بارٹنڈرس آپ کے آرڈر کے مطابق شرابوں اور کاک ٹیلوں کے جام تیار کرتے اور شاندار حسیناؤں کی جوئے کی مشینوں اور تاش کے پتوں پر ڈالر کا ہیرا پھیر ہوتا۔ عجیب دنیا، عجیب ماحول اور عجیب فضا جہاں آدمی جب تک اس کے وائلٹ میں وزن ہوتا، لٹ لٹ کر خوش ہوتا، چور کے لیے یہ مقام ایک اور وجہ کشش تھا۔ وہ جیب کترا نہ تھا لیکن اس ماحول میں وہ اپنے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے موقع پا کر اپنے ہاتھ کی صفائی آزما لیتا اور اپنا خرچہ بھی نکال لیتا۔ اگر چہ اس رات نے کوئی واردات نہیں کی تھی تاہم اس کا وائلٹ وزنی تھا ایسی حالت میں چور کے لیے اس عالیشان مقام سے زیادہ بہتر غمگساری کی جگہ نہیں ہو سکتی تھی لیکن راستے میں ایک ایسی عجیب بات ہوئی جو اس سے قبل کبھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ راستہ اس کے لیے نیا نہیں تھا وہ بے شمار مرتبہ اس راہ سے گزرا تھا۔ لیکن اس سے قبل اس کی نظر اس عمارت پر نہیں پڑی تھی۔ وہ ایک اللہ کا گھر تھا—— یوں تو شہر میں ''اللہ کے گھروں'' کی بہتات تھی اس شہر کا شمار دنیا کے بڑے شہروں میں ہوتا تھا۔ اس میں دنیا کے ہر مذہب کے لوگ آباد تھے۔ جتنے مذہب تھے اتنے اللہ اور جتنے اللہ اتنے (ان سے بہت زیادہ) ان کے گھر۔ اس کے قدم زندگی میں پہلی بار کسی اللہ کے گھر کے دروازے پر رکے تھے۔ اس کا دروازہ نیم وا تھا۔ اس نے بلا ارادہ آسمان کی جانب نگاہ ڈالی۔ آسمان پر نیلاہٹ غالب آ رہی تھی رات صبح کی جانب رینگنے لگی تھی۔ چور نے سوچا اللہ تو آسمان پر رہتا ہے تو اس کے گھر زمین پر کیوں ہیں؟ کیا اللہ واقعی زمین

کے گھر میں رہتا ہے۔ کہیں یہ گھر محض دکھاوے کے تو نہیں جو آدمیوں نے آدمیوں کو بیوقوف بنانے کیلئے بنا لیے ہیں۔ جس طرح آدمیوں نے اقوامِ متحدہ بنا لی ہے اور اس کے تحت بیسیوں جھوٹے سچے کمیشن اور ادارے بنا لیے ہیں۔ ان میں سے اکثر ادارے اور کمیشن وغیرہ مضحکہ خیز ہیں۔ مثال کے طور پر کوئی مظلوم ملک اقوامِ متحدہ میں کسی طاقتور ملک کے ظلم وستم یہاں تک کہ اس کی زمین پر ناجائز قبضے کے خلاف فریاد داخل کرتا ہے اور اس کی فریاد پر اقوام متحدہ میں کوئی قرارداد پیش ہوتی ہے تو کوئی بھی ملک جس کو 'ویٹو پاور' حاصل ہے اس قرارداد کو ویٹو کے ذریعے بے اثر کر دیتا ہے اور نتیجہ 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اگر لاٹھی ہی حق کی کسوٹی ہے تو یہ اقوامِ متحدہ وغیرہ کے ڈھکوسلے کس لیے۔ لاٹھی کا فیصلہ تو ایک ایسی حقیقت ہے جس کو آدمی، جانور، پرندے یہاں تک کہ حشرات الارض روزِ ازل سے مانتے آئے ہیں اور شاید یہ حیا تیاتی جینوں میں اپنا مقام بنا چکا ہے۔ سو اس کو تسلیم کرنا، اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا اتنا مشکل نہ ہو جتنا اقوام متحدہ کی بے حیائی، ڈھٹائی اس کو بنا دیتی ہے تم نے حق کا خون کیا ہے تم قابل ملامت ہو اور ساری قوموں نے باہم مل کر یہ فیصلہ دیا ہے کہ تم کو ظلم اور ناانصافی سے باز رکھا جائے لیکن تمہارے خلاف ہم کوئی اقدام نہیں کریں گے۔ اور تو اور تمہارے خلاف قرارداد مذمت بھی منظور نہیں کی جا سکتی کیونکہ تمہاری پیٹھ پر ایک ویٹو طاقت کا ہاتھ ہے اور اے مظلوم ملک وقوم تم دفع ہو جاؤ۔ حق کیا ہے اور کیا حق نہیں ہے اس سے ہمیں کوئی مطلب نہیں۔ حق وہی ہے جس کو ویٹو طاقتیں مانیں باقی ناحق۔ چور اللہ کے گھر کے بڑے دروازے کے سامنے کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا آیا اللہ کا گھر واقعی اللہ کا گھر ہوتا ہے؟ اس نے بے سہارا ہونے کے باوجود ایک بھرپور زندگی گزاری تھی۔ عام لوگوں کی طرح بلکہ بعض معاملات میں خاص آدمیوں کی مانند۔ تعلیم، کھیل اور تفریح کسی بھی میدان میں وہ پیچھے نہیں رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ضروریات چوری کر کے پوری کی تھیں۔ چوری اس کا جاب ہی نہیں کیریئر بھی تھا۔ اگر چہ پولیس کے تجسس سے محفوظ رہنے کے لیے وہ بظاہر کوئی نہ کوئی جاب بھی کرتا رہا تھا لیکن اس آمدنی کو وہ ضرورت مندوں اور خاص طور پر بے سہارا لڑکے لڑکیوں پر خرچ کرتا تھا جن کو ان کے والدین نے چھوڑ دیا ہو، دردر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے وہ آدمیوں جیسا تھا لیکن قدرے مختلف کیونکہ وہ چور تھا وہ چوروں جیسا تھا لیکن قدرے مختلف کیونکہ وہ آدمی تھا جس کی آدمیت کو چوری نے زنگ آلود نہیں کیا۔ چوری کے ضمن میں وہ جن کو اپنا شکار بناتا ان کے بارے میں وہ اچھی طرح معلومات حاصل کرتا تھا کہ آیا وہ شکار ہونے کے، سماجی انصاف کے تحت حقدار ہیں۔ تب وہ ان کو شکار بناتا۔ عام طور پر چوروں ہی کو شکار بناتا ایسے چوروں کو جو قانون کی نظروں میں چور نہیں تھے کیونکہ قانون کو اصل سچ کی جگہ قانونی سچ سے سروکار ہوتا ہے۔ اس رات اللہ کے گھر کے سامنے کھڑا وہ سوچ رہا تھا۔

''کیا اسے اندر جانا چاہیے؟'' اتنی طویل زندگی کے دوران وہ کسی اللہ کے گھر میں نہیں گیا تھا چوری کرنے کے لیے بھی نہیں۔ اس نے مذہب و ادیان کو پڑھا تھا لیکن کسی مذہب، دین اور مت سے وہ متاثر نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ چور کے ساتھ اللہ کا رویہ کیسا ہو سکتا ہے اس کو یہ علم تھا جس طرح گلّے سے بھٹکی ہوئی بھیڑ کے پیچھے چرواہا جاتا ہے اسی طرح اللہ اور اس کا پیغمبر بھٹکے ہوئے آدمی کے پیچھے جاتا ہے۔ وہ چور تھا اور ایک بھٹکا ہوا آدمی۔ کیا اللہ اور اس کا کوئی پیغمبر اس کے پیچھے آئے گا۔ یا اس پر لعن طعن کرے گا؟۔ وہ اللہ کے گھر کے نیم وا دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

سورج شاید طلوع ہو چکا تھا کیونکہ آسمان کالے سے اودا اور اودے سے نیلا ہو چکا تھا۔ سورج آدمی کو دکھائی دینے سے بہت پہلے آسمان

کے رنگ میں تبدیلیاں لانے لگتا ہے۔ جس وقت چور اللہ کے گھر سے باہر آیا آسمان کی نیلاہٹ مزید ہلکی ہو چکی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ روشنی سے دھو لیا تھا۔ چور کی چال ڈھال، انداز اور چہرے مہرے سے یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ اللہ کے گھر میں اس پر کیا گزری؟ آیا کچھ گزری بھی؟ چور کا معاملہ روایت سے الٹا تھا چرواہا بھٹکی ہوئی بھیڑ کے پیچھے نہیں گیا تھا بلکہ بھیڑ خود چل کر چرواہے کے پاس آئی تھی۔ ایسی بھیڑ کے ساتھ چرواہا کیا کرے گا، یہ کون بتا سکتا ہے؟ کیا وہ اس بھیڑ کو اپنے سے لپٹا لے گا؟ اس کے سر پر سینگوں کی درمیانی جگہ پر ہاتھ پھیرے گا؟ گردن تھپتھپائے گا؟ یا اپنی چھڑی سے دو، تین رسید کریگا؟ چرواہا ماورائے قیاس۔

Un-predictable تھا یا صورت حال غیر متوقع اور غیر معمولی تھی؟ یہ بھی تو سوچنے کی بات ہے کہ بھیڑ (چور) نے چرواہے سے کیا کہا ہوگا؟ اگر کچھ مانگا تو کیا مانگا ہوگا؟ بھیڑ چرواہے سے کیا مانگتی؟ پانی یا گھاس کے علاوہ اس کو مانگنا ہی کیا تھا؟ چور کو کیا مانگنا تھا؟۔ چور کا مسئلہ تھا ''چوری'' کی رفاقت سے محرومی تو کیا اس نے اللہ سے ''چوری'' کو مانگا ہوگا؟ دنیا کے ہر جانے مانے مذہب میں چوری منع ہے۔ پھر کسی بھی اللہ کے گھر میں گھس کر کوئی ذی عقل اور ذی ہوش آدمی کسی بھی اللہ سے ''چوری'' کی رفاقت کی التجا کر سکتا ہے؟ کیا چور ایسی حماقت کا مرتکب ہو سکتا ہے؟۔ اس پس منظر میں تو چور کا اللہ کے گھر میں داخل ہونا حماقت ہی لگتا ہے۔ اگر اس کا مقصد توبہ تلاّ نہ ہو۔ تو کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ چور نے اللہ سے معافی تلافی کر لی اور آئندہ زندگی عبادت، ریاضت اور زہد و تقویٰ میں بسر کرنے کا عہد کیا تھا؟ قریب قریب ہر مذہب میں اللہ کا ارشاد ہے کہ بندہ اگر خلوص دل سے توبہ کرے تو اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسے وہ اس وقت ماں کے پیٹ سے باہر آیا ہو۔ کیا چور کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ چور دھیرے دھیرے قدم رکھتا ہوا اللہ کے گھر سے باہر آیا تھا۔ اس کا چہرہ نہ تو مکمل طور پر (Blank) خالی تھا۔ نہ ہی اس پر اللہ کی پھٹکار تھی۔ اور نہ ہی وہ کیفیت جس کو قبولیت توبہ کا نور کہا جائے۔ جیسے ہی چور اللہ کے گھر سے باہر نکلا ایک پرچھائیں جیسا وجود اس کی جانب بڑھا اور کچھ ایسی آواز میں اس سے مخاطب ہوا جیسے وہ آواز چور کے کانوں میں داخل ہونے کے بجائے براہ راست چور کے ذہن میں داخل ہو رہی ہو۔ اور اپنا جواب بھی براہ راست وصول کر رہی ہو۔ ''ہیلو۔ ہائی دوست!'' اللہ سے یہ ملاقات Meeting کیسی رہی؟'' کیسی؟ اوں۔ آدم۔ لیکن آپ کون ہیں؟ اور آپ سے مطلب؟'' ''میں کون ہوں؟ کوئی اور ہوتا خاص طور پر کوئی مذہبی آدمی، پادری، پجاری، ملا، بھکشو وغیرہ تو اس سوال کا جواب گھما پھرا کر دیتا لیکن تم تو چور ہو۔ تم کو سیدھا اور صاف جواب دونگا۔ میرا نام اس کے نام کے برعکس (Antonym) انٹو نائم ہے۔ جس کے گھر سے تم ابھی ابھی باہر آئے ہو۔''

چور نے پہلی مرتبہ اپنے مخاطب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اس کو بچپن سے یہ بات معلوم ہے کہ مکھی کی آنکھ بے شمار آنکھوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ طوطا جلدی جلدی نظریں گھماتا ہے اور بلی کی آنکھ روشنی کے کم اور زیادہ ہونے کے ساتھ نہ صرف چھوٹی، بڑی ہوتی بلکہ رنگ بھی بدلتی ہے۔ جن آنکھوں میں وہ اس وقت جھانک رہا تھا وہ جلدی جلدی جل بجھ رہی تھیں اور وہ چہرے پر تقریباً ہر جگہ موجود تھیں لیکن اس طرح کہ لحظہ لحظہ پیدا بھی ہو رہی تھیں اور غائب بھی۔ اس طرح ظاہر اور غائب ہونے والی بے شمار آنکھوں میں جو روشنی جھلک اٹھتی تھی وہ کسی بھی دوسری روشنی کے مماثل نہیں تھی۔ اس کا تھوڑا بہت شائبہ شعلے کے اندر والی روشنی میں ملتا تھا۔ آنکھوں سے اپنی آنکھیں بچا کر جب اس نے اپنے مخاطب کے پورے حلئے پر نظر ڈالی تو اس کے سامنے جو وجود تھا اس کی ہر چیز غیر معمولی تھی جیسے اس کے سر پر کبھی سینگ دکھائی دیتے تھے

کبھی غائب، بال بھی کبھی سیدھے کھڑے ہوئے، کبھی صفا چٹ، کان کبھی ہاتھی جیسے، کبھی خرگوش جیسے اور کبھی غائب، بھنویں غائب پلکیں ندارد، منہ کبھی کانوں تک پھیلتا ہوا تو کبھی تھوتھنی جیسا آگے کو نکلا ہوا۔ ناک کی جگہ صرف سوراخ، بکرا داڑھی، تھوڑی مخروطی، جسم لمبے سے کوٹ میں غیر محسوس، ہاتھوں کی انگلیاں لمبی، ناخن نوکدار اور شاید دانت بھی نوک دار۔ چور ہکّا بکّا اپنے مخاطب کو گھورنے لگا۔ اگر چہ کہ وہ ایک مضبوط دل کا آدمی تھا لیکن اس کی ریڑھ کی ہڈی سے جاڑے کی ایک لہر پورے بدن میں دوڑ گئی۔

''یہ تم کیا کرنے لگے مجھ کو اس طرح گھورو گے تو ہوش گنوا بیٹھو گے۔ میں دیکھنے کی چیز نہیں ہوں سننے کی چیز ہوں۔ تم نے دیکھا میں اپنی بات بولتا بھی نہیں صرف دوسروں کے دل و دماغ میں اتار دیتا ہوں۔ اب تو تمھیں میرا جواب مل گیا میں کون ہوں۔ میں Devil ڈیول ہوں۔ راکھشس ہوں، ابلیس ہوں لوسیفر Lucifer ہوں۔ شیطان ہوں۔ تمہارا دوسرا سوال کہ مجھے تم سے اور تمہارے معاملات سے کیا مطلب؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس گھر والے نے تمھیں مایوس کیا ہے تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔''

''وہ کس طرح''

''وہ اس طرح کی میں چوری کی رفاقت سے محرومی کے مسئلے میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔''

''کیا تم ''چوری'' کو میری زندگی میں لوٹا دو گے؟''

''نہیں میں یہ نہیں کرسکوں گا۔''

''جب تم میری چوری نہیں دلا سکتے تو پھر میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟''

''میں تمہارے لیے بہت کچھ کرسکتا ہوں مثال کے طور پر میں تمھیں چوری کے بدلے ایک سے ایک اچھی رفیقہ یا رفیق دے سکتا ہوں۔''

''مثال کے طور پر''

''آج کل چوری کو کون پوچھتا ہے۔ جرائم کی دنیا میں چوری گھٹیا ترین جرم سمجھا جاتا ہے۔ معاف کرنا دوست تم ایک بے عزت اور ذلیل پیشے سے منسلک رہے ہو۔ خوش قسمتی سے چوری تم سے بچھڑ گئی اور تمھیں اس پیشے سے چھٹکارا مل گیا۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو چوری گھٹیا قسم کا جرم ہے۔ میں چوری کے خلاف ہتک آمیز گفتگو برداشت نہیں کرسکتا۔ بہتر ہوگا تم اس سے پرہیز کرو۔ دوسری بات یہ کہ میں نے بچپن سے چوری کی ہے لیکن اس کو جرم خیال نہیں کیا۔ میں تو چوری اس لیے کرتا ہوں کہ شروع سے چوری کرتا آیا ہوں اور میری پیاری 'چوری' مجھ سے چوری کرواتی رہی ہے۔ رہا یہ کہ میں ایک شاندار چور ہوں۔ چوری بھی شان سے کرتا ہوں۔ نہ تو گھٹیا چور ہوں اور نہ ہی میری کی ہوئی چوریاں گھٹیا''۔

''ارے تم تو خفا ہونے لگے۔ تمہارے خیالات میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ تم معاف کرنا اگلے وقتوں کی اخلاقیات سے باہر نہیں نکلے۔ چور ہو لیکن ابھی تک اقدار میں یقین رکھتے ہو۔ دوامی اور آفاقی اقدار۔ سچائی، انصاف اور حسن — پھو! شاعرانہ انصاف۔ سب پرانے سڑے ہوئے ماضی کی خرافات۔ اخلاقی اقدار۔ جمالیاتی اقدار۔ تم جدلیاتی مادیت کے فلسفے سے بالکل بے بہرہ ہو۔ ہیگل تک سے تم شاید ناواقف ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مارکس کی جدلیات پر چلو لیکن کم از کم اقدار کی لغویات سے باہر نکلو۔ ہندستان کا پنڈت چانکیہ ماضی کا آدمی

ہوتے ہوئے بھی تم سے زیادہ جدید آدمی تھا۔اس کا یورپی ہم خیال میکاولی بھی قدیم ہوتے ہوئے کم از کم تم سے جدید تر''

''بس بس میرے بزرگ!''

''یہ تم نے مجھے بزرگ کہہ کرایک حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ میں تمہارے جدِّ امجد سے بھی پہلے کا ہوں لہذااس کی ساری نسل کا بزرگ ہوں— لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم کیا کہنے جا رہے تھے''

''میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم مجھے فلسفہ نہ پڑھاؤ مجھ کو ہیگل، میکاولی یا چانکیہ جن کو پڑھنا ہوگا خود پڑھ لوں گا۔''

''پڑھانا تو میرا پیشہ ہے برخوردار۔تمہارے جدِّ امجد کی پیدائش تک میں فرشتوں کو پڑھانے پر معمور تھا۔''

''مانتا ہوں—ایک سے زائد مذہبی کتابوں میں اس کا ذکر موجود ہے کام کی بات کرو۔''

''کام کی بات یہ ہے کہ تم اپنا یہ کام، جاب یا کیرئر جو کچھ بھی ہے بدلنے پر غور کرو—اور—اور اخلاقی اقدار، جمالیاتی اقداراور الم علم کی افاقیت اور ابدیت سے نجات پاؤ۔دنیا بلکہ ساری کائنات تیزی سے بدل رہی ہے اتنی تیز کہ اس کے ساتھ چلنا مشکل ہو رہا ہے یہ فرسودہ بے بنیاد نظریات آدمی کے پاؤں کی زنجیریں ہیں ان کو کاٹ کر پھینک دو اور آج زندہ رہنے اور باقی رہنے کے لیے چلنا نہیں اُڑو—اڑو۔اور تیز اُڑو''

''بس اب مجھے زیادہ نہ چڑھاؤ— میں حقیقت پسند ہوں۔میں ہواؤں میں نہیں رہتا۔زمین پر رہتا ہوں۔''

''یہی تو تمہاری خرابی ہے تم زمین پر رہتے ہو جبکہ دوسرے آدمی ہواؤں میں ہی نہیں بلکہ خلاؤں میں مصروف پرواز ہیں''

''براہ کرم مجھے زمین پر رہنے دو۔مجھ سے زمین ہی کی بات کرو۔''

''چلو زمین کی بات کرتے ہیں تمہارے لیے کوئی ایسا کام، ایسا پیشہ (کیرئر) منتخب کرتے ہیں جو زمین کو بدلنے میں کام آئے''

''ٹھہرو......کیا تم امریکہ کے ''نیو ورلڈ آرڈر'' کی بات کرنے لگے۔''

اس بات پر وہ ہنسا اس کے نوکیلے دانت باہر آگئے اور چہرے پر یک لخت بے شمار آنکھیں چمک اٹھیں وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ میری بات پر ہنستا رہا— اور بولا۔

''امریکہ کا نیو ورلڈ آرڈر کوئی نئی چیز نہیں ہے—جوان! ہر قوم جس کو عروج نصیب ہوا اس نے دنیا میں نیو ورلڈ آرڈر لانے کی کوشش کی۔قدیم چین، جاپان، ہندستان، مصر، بابل، یونان، روم سے لیکر آج کے امریکہ تک— یہ سب تو چلتا رہتا ہے۔ہمیں تو اپنا کام کرنا چاہئے۔''

''اپنا کام— کیسا کام''

''مثال کے طور پر تم ''دہشت گرد'' بن جاؤ—ایک عالمی دہشت گردی کی تنظیم کی داغ بیل ڈالو۔''

''دہشت گردی یہ تو بہت بری چیز ہے— قتل وغارت، تباہی، تخریب۔نہیں نہیں۔یہ سب مجھ سے نہ ہوگا۔یوں بھی دہشت گردی کی بے شمار تنظیمیں پہلے ہی ساری دنیا میں سرگرم عمل ہیں۔''

''دہشت گردی نہیں کر سکتے—جو آدمی چور بن سکتا ہے۔وہ سب کچھ بن سکتا ہے۔دہشت گرد بھی۔دوسرے لوگ اس میں پہلے سے

ہیں تو کیا ہوا۔ چور بھی تو پہلے سے تھے۔ تم چور کیسے بنے۔ ہر پیشے میں، ہر کام میں اوپر جگہ خالی رہتی ہے جس طرح تم چور بنے تو بقول تمہارے شاندار چور بنے۔ دہشت گرد بنو تو شاندار دہشت گرد بنو — تم دہشت گردی کے ساتھ منشیات (ڈرگ) بھی چلاؤ دو دھاری تلوار بنو۔''

''اف اف — یہ تم کیا کہہ رہے ہو — میں یہ سب کروں — یہ مجھ سے نہ ہوگا — یہ میں نہیں کروں گا — نہیں — ہرگز نہیں —''

اچانک اس وجود نے چور کو اپنے فرغل میں گھسیٹ لیا اور پچکارنے کے انداز میں بولا۔

''تم سے یہ سب ہوگا — میرے پیارے سے نئے چیلے'' اور کچھ دیر کے لیے دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ دن پوری طرح روشن ہو گیا اور زندگی کی ہما ہمی پوری طرح شروع ہو گئی۔ شہر کی ٹریفک کا عفریت اپنے مخصوص انداز میں پھنکارنے اور چیخنے لگا۔ چور ایک مرتبہ پھر دکھائی دیا۔ اب کی مرتبہ وہ اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ اس خاص اپارٹمنٹ کی وہی لڑکی تھی جس نے رات ایک گاہک کے ساتھ ہونے کی وجہ سے چور کو ''رانگ نمبر'' کہہ کر چلتا کر دیا تھا۔ وہ نیم برہنہ تھی لیکن اس نے اپنا بدن ایک لمبے کوٹ میں چھپایا ہوا تھا اس کا چہرہ تازہ دھلا ہوا تھا۔ میک اپ بھی نیا تھا چور نے البتہ منہ بھی نہیں دھویا تھا۔ دونوں کے چہروں پر شب بیداری کی چھاپ تھی اور بدن بھی تھکے ہوئے۔ چور نے اپنی ساتھی کو مخاطب کر کے سوال کیا۔ ''تم میری 'چوری' ہو — نا!''

''میں ثریا ہوں — ثریا — تمہاری اپنی ثریا''

''نہیں تم میری ''چوری'' ہو — میری اپنی ''چوری'' اب تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گی — کہیں بھی نہیں — کبھی بھی نہیں — بولو۔ ہاں''

''پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو — چلو مان لیا میں ہی تمہاری ''چوری'' ہوں۔ تمہاری اپنی ''چوری'' اور ہاں میں تمہیں چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گی — کبھی نہیں — بس — اب تم خوش رہو!''

''ہاں میں اب خوش ہوں — بہت خوش — آج میں تمہیں جہاں بھی لے جاؤں۔ چپ چاپ چلی چلنا —''

''ہاں ڈارلنگ آج سے میں تمہاری ہوں — تم نے بہت انتظار کروایا — اب میں تمہاری ہوں۔ مکمل طور پر تمہاری — اور تم مجھے جہاں بھی لے جاؤ — چلوں گی — جہنم میں بھی''

''That is my good Girl''

اور پھر یہ ہوا کہ چور لڑکی کا ہاتھ پکڑے اللہ کے گھر میں داخل ہو گیا۔ اس نے لمبا فرغل پہنے ہوئے اس وجود کو قطعی طور پر (Ignore) نظر انداز کر دیا جس نے اس کا راستہ روکنے کی ناکام کوشش کی۔

☆☆☆

......آ گہی کا سفر......

اس عجیب وغریب اشتہار کو میں عرصۂ دراز سے پڑھتی آئی تھی لیکن اس مرتبہ وہ میرے ذہن کے اس گوشے میں اتر پڑا جہاں سے آدمی کو عمل کی ترغیب ملتی ہے اور میں حرکت میں آ گئی۔ اشتہار کے الفاظ میں نیچے درج کئے دیتی ہوں۔ اس تحریر کی ضرورت یوں پیش آئی کہ اشتہار ایک سفر سے متعلق تھا۔ میں نے سوچا مجھ سے قبل قدیم زمانے سے سفر پر نکلنے والوں میں سے اکثریت نے روزنامچے، یادداشتیں ڈائریاں اور سفرنامے قلم بند کئے تھے جن میں سے بعض کی افادیت بعد میں کھل کر سامنے بھی آئی، لہٰذا مجھے بھی ایک روزنامچہ تیّار کرنا چاہئے۔ شاید اس کا لکھنا بھی ایک مثبت اقدام ثابت ہو۔ سو یہ ہے میری تحریر کا شانِ نزول۔ پہلے متذکرہ اشتہار جو الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر ساری دنیا میں دکھایا جا رہا تھا۔

''آ گہی کے سفر پر جانے کے خواہشمند مسافروں سے درخواست ہے کہ اپنی قریب ترین بندرگاہ یا طیارہ گاہ پر دن اور رات کسی بھی وقت پہنچ جائیں، اپنے لباس پر کسی بھی نمایاں جگہ پر ''آ گہی'' کا لفظ لکھ دیں اور کچھ دیر انتظار فرمائیں۔ ہمارے عملے کے لوگ آپ کے سفر کا سارا انتظام خود ہی انجام دیں گے۔ لفظ ''آ گہی'' کسی بھی زبان میں تحریر کیا جا سکتا ہے۔ اخراجاتِ سفر ہمارے ذمّے۔ اسباب کی ضرورت نہیں۔ دستاویزاتِ سفر آپ کا مسئلہ نہیں۔ آپ کی حفاظت، جملہ ضروریات، کھانا، دیکھ بھال، دوائیاں، ہیلتھ کیئر ہمارے ذمّے''۔

منجانب نگراں ''آ گہی کا'' سفر

میں نے اشتہار کے الفاظ من وعن مطابقِ متن درج کر دیئے ہیں۔ دنیا بھر میں اور شاید دنیا کی ہر زبان میں اس اشتہار کا مضمون یکساں تھا اب آپ یہ نہ پوچھنے بیٹھ جائیں کہ میں نے اس اشتہار کی کوئی تصدیق وغیرہ بھی کی یا نہیں۔؟ ظاہر ہے مجھ جیسی عورت جس کو ایک دنیا فرنٹ لائن رائٹر کے طور پر جانتی ہے جس نے دنیا کی اعلیٰ ترین جامعات سے اعلیٰ ترین امتحانات، اعلیٰ ترین اعزازات کے ساتھ پاس کئے ہوں اتنی سادہ لوح نہیں ہو سکتی کہ اس اشتہار پر یقین کر لیتی۔ میں نے پہلے پہل اس اشتہار کو دیوانے کی بڑ قرار دے کر اپنے ذہن کی کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا۔ اس کا سبب صاف تھا دنیا کے کسی بھی ادارے نے اس اشتہار کی اشاعت کی ذمّہ داری قبول نہیں کی تھی۔ میں نے دنیا کے بڑے بڑے معتبر اخباروں کے مدیروں سے لے کر مالکوں تک کو بھی کھڑ کھڑا لیا تھا۔ خود بھی انٹرنیٹ پر اور چند ایک ماہرین انٹرنیٹ کے تعاون سے بھی ''آ گہی'' کے سفر اور اس کے کرتا دھرتا لوگوں کا پتہ چلانے کی کوشش کی تھی مگر بے سود — میں نے دنیا کے طاقتور ترین ممالک کے اطلاعاتی وتحقیقاتی اداروں سے بھی رجوع کیا مگر بے نتیجہ۔ اس معاملے کو قومی اور بین الاقوامی سیکیورٹی کا معاملہ بنانے کے بھی ممکنہ جتن کر ڈالے لیکن وہی ڈھاک کے تین پات — میں نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ اس اشتہار کے مشتہرین پر ہاتھ کیوں نہیں ڈالا جا رہا ہے۔؟ اس کے

لئے مالی ادائیگیاں کرنے والوں سے پوچھ گچھ کیوں نہیں کی جارہی ہے۔؟ میرے ان آخری سوالات کا جو جواب ملا اس نے مجھے حیران، پریشان، چوکنا اور لاجواب کردیا۔

وہ جواب یہ تھا کہ مذکورہ اشتہار آپ ہی آپ نشر ہو رہا ہے اور طبع ہو رہا ہے۔اس کو روکنے کی بھی ساری تدبیریں بےکار گئی ہیں۔اس جواب کے ملنے کے بعد میں نے اس اشتہار کے بارے میں سوچنا قطعی چھوڑ دیا۔اپنے ذہن کو اس خیال سے بہلا دیا تھا کہ اس کے عقب میں کسی عالمی بڑی طاقت کا ہاتھ تھا ورنہ یہ سب ٹیکنالوجی کے طور پر اتنا اعلیٰ، اتنا جدید، اور ظاہری طور پر اتنا حیران کن اور ناقابلِ فہم نہیں ہوسکتا تھا۔ایک زمانے میں اُڑن تشتریوں کا مسئلہ سامنے آیا تھا جو بغیر حل ہوئے دب گیا تھا۔ برمودا ٹرائینگل، (برمودا کے مثلث) کا معاملہ بھی زور وشور سے اٹھا اور ڈوب گیا۔کسی بڑی طاقت کے قبضے میں ''ایلین'' کی موجودگی کی افواہوں کا بھی کچھ ایسا ہی حشر ہوا۔میری طرح اور بھی لوگ ہونگے جو اس اشتہار کو اس مرحلے تک پہنچا کر عاجز آ گئے ہوں گے۔ میں بھی عاجز آ چکی تھی، ہار چکی تھی اور بالآخر اس کو بھلا چکی تھی تا آنکہ وہ خود میرے ذہن میں اتر پڑا اور مجھ کو متحرک کرنے میں کامیاب ہو گیا۔مجوزہ سفر کے لئے میں آپ ہی آپ تیار ہو گئی۔میری ہر حرکت بلا ارادہ سرزد ہوتی گئی۔میں نے کسی بھی دوست یا رشتے دار کو اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔میں جانتی تھی سب اپنی اپنی زندگیوں میں مگن مطلبی لوگ تھے جو کسی ذاتی غرض کی بناء پر مجھ سے رجوع ہوتے اور غرض کے پورے ہوتے ہی مجھ میں یا میرے کسی کام میں کیڑے نکال کر مجھ سے کٹ جاتے۔ میں شادی کرنے کی کوشش میں بھی ناکام رہی تھی۔ میں شاید مردوں کی نظر میں ضرورت سے زیادہ پڑھی لکھی اور لکھنے والی کے طور پر غیر معمولی مشہور ومعروف سلیبریٹی تھی اور مردوں کی اکثیریت کی نظروں میں سلیبریٹی عورت'' گھر نہیں بنا سکتی۔''میرا کوئی بوائے فرینڈ بھی نہیں تھا۔کیونکہ جن دنوں میں ''گرل'' تھی کسی لڑکے کی گرل فرینڈ نہ بن سکی تھی۔کسی لڑکے کی مجال نہیں ہوئی کہ مجھے اپنی آئس کریم چاٹنے کے لئے پیش کرے۔رہا کافی یا چائے کی رفاقت تو کوئی لڑکا مجھے اسکی دعوت دینے کی حماقت کر بیٹھتا تو اس کے دماغ کے سارے طبقات روشن ہو جاتے جب وہ دنیا کے کسی بھی موضوع پر میرے آگے زبان کھولتا۔جب میں گھر سے نکلنے کو تھی تو میرا بہت دل چاہ رہا تھا کہ میرا کوئی ہوتا جس کے نام پیغام چھوڑتی۔تاہم رسم پوری کرنے کے لئے میں نے میز پر رکھے ہوئے کیلنڈر کے ایک گوشے پر لکھا۔''ہیلو ڈیئر۔۔۔میں آ گہی کے سفر پر جا رہی ہوں، مجھے اچھے سفر کے لئے'' وش'' کرو۔تمہاری جو بھی تم سمجھو۔۔''اپنے جیکٹ کے کالر پر'' آ گہی'' کا ٹیگ لگایا اور ایک چھوٹے سے ہینڈ کیری کو گھسیٹتی ہوئی باہر نکل پڑی۔قریبی ایئرپورٹ پر گاڑی پارک کی اور انتظار گاہ میں داخل ہو گئی۔میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب میں نے دیکھا کہ ادھر میں انتظار گاہ میں داخل ہوئی اُدھر ایک سرو قد ایئر ہوسٹس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، مسکرائی اور'' آ گہی'' کا ٹیگ میرے کالر سے جدا کیا اور ایک نیلے رنگ کی فائل میں ڈال دیا۔اپنے ساتھ آنے کا ہلکا سا اشارہ کیا۔میرے ساتھ اس ہینڈ کیری کے علاوہ کوئی اور اسباب نہیں تھا۔ایئرپورٹ پر مختلف مقامات پر الگ الگ ایئر لائنوں کے مسافروں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ مذکورہ ایئر ہوسٹس کے عقب میں قطاروں سے بے نیاز میں آگے بڑھتی گئی۔آخر میں وہ ایک دروازے کے سامنے جا کر ادب سے ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے پہلی بار اس کے چہرے پر کھل کر نظر ڈالی یا شاید اس نے مجھے ایسا کرنے دیا۔اس کا چہرہ روشنی سے بنا تھا اس سے آنکھیں ملانے کی مجھے ہمت نہیں ہوئی۔اس کی آواز جو مجھے بے حد دلکش اور پُر

اعتماد لگی میرے کانوں میں اتری۔وہ کہنے لگی۔'' آگے کا دروازہ کھولو، جہاز کا زینہ چڑھو،ایک انتہائی اہم اور دلچسپ سفر تمہارا منتظر ہے۔ یہ رہا تمہارا بورڈنگ کارڈ۔'' ایئر ہوسٹس کے ہاتھ نے میری جانب کارڈ بڑھایا۔میں نے کارڈ تھاما، دروازہ کھولا اور ہینڈ کیری گھسیٹتی ہوئی اندر چلی گئی۔بائی بائی۔'' ایئر ہوسٹس کی آواز مجھے باہر سے اندر آتی ہوئی معلوم ہوئی۔میں نے سوچا یہ عجیب سفر ہے نہ قطاریں لگیں، نہ کلیئرنس کروایا بس جہاز کے اندر ہو گئے۔یہ کیسی فضائی کمپنی تھی کہ انتظار گاہ میں داخل ہوتے ہی فضائی میزبان خدمت میں حاضر۔ایسا تو صرف وی۔وی آئی۔پی (بہت زیادہ اہم) کے ساتھ ہوتا ہوگا۔

جہاز کے اندر سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا ہوا کرتا ہے۔ایک انتہائی خوبصورت فضائی میزبان نے مجھ سے بورڈنگ کارڈ طلب کیا۔نصف حصہ خود رکھا اور نصف مجھے لوٹا دیا۔اور انتہائی خوش اخلاقی سے، مجھ سے آگے چلتے ہوئے میری نشست کی نشاندہی کی۔میری ہینڈ کیری کو میری نشست کے نیچے رکھا۔اور اس سے پہلے کہ میں اپنی نشست پر اپنے آپ کو جماتی وہ جہاز کی فضا میں تحلیل ہوگئی۔بیٹھنے کے ساتھ ہی میں نے اپنے پڑوس میں بیٹھے ہوئے مسافر پر ایک چور نظر ڈالی مبادا وہ میرے اس تجسس کو ناشائستگی سے تعبیر کرے لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا میرے ساتھ کی نشست پر بیٹھا ہوا مسافر جو ادھیڑ عمر کا ایشیائی دکھائی دے رہا تھا۔وہاں موجود ہونے کے باوجود غیر موجود تھا۔میں نے اس کو 'ہائی، ہیلو' کہنا چاہا تا کہ اس کو پتہ چلے کہ اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھنے والی عورت کوئی مہذب خاتون ہے لیکن یہ کیا میری زبان پر دو حرفی اور چار حرفی لفظ بھی نہ آ سکے۔میں نے بار بار منہ کھولا، ہونٹوں کو حرکت دی، حلق کے عضلات کو تکلمی جنبشیں دیں، زبان کو اٹھایا، بٹھایا، گھمایا ،دائیں بائیں ہر طرح کی حرکت دی، پھیلایا، سکیڑا، سمیٹا، گولائی میں لپیٹا، آواز کے حجرے (ساؤنڈ بکس) پر پوری توانائی صرف کردی لیکن میرے حلقوم سے کوئی آواز برآمد نہیں ہوئی اتنی ساری کوششوں میں ناکامی کے باوجود میری ہیلو، ہائی میرے بازو والے آدمی تک پہنچ گئی اور اس شریف آدمی کے چہرے پر اس کی رسید اور جواب صاف طور پر تحریر ہوگیا۔خود میرے اندر اس کی جوابی ہیلو، ہائی بھی نازل ہو چکی تھی۔اس شریف آدمی نے محسوس کیا ہو یا نہ کیا ہو، میں نے یہ حیرت ناک حقیقت محسوس کر لی۔اس فضائی میزبان نے مجھ سے جس طرح کلام کیا جس نے ایئر پورٹ سے جہاز کے گیٹ وے تک میری رہبری کی۔اور اب ہم دونوں مسافروں نے جس طرح ہیلو، ہائی کیا۔اس سے مجھ پر واضح ہوگیا۔یا میرے مولا۔! یہ بغیر الفاظ کے بات چیت کا انوکھا طریقہ تھا۔اس سے آپ فارسی کی اس شاعرانہ کہاوت کی طرف ذہن کو نہ لے جائیں۔'' خموشی معانی دارد کہ در گفتن نمی آید''۔کیونکہ یہاں معاملہ بالکل مختلف تھا'' اس کو بغیر الفاظ کے بات چیت کہنا درست ہوگا یا اس کے لئے کوئی نئی اصطلاح اختراع کرنی پڑے گی'' میں نے سوچا'' دوسرے آدمی کے خیالات میرے ذہن کے اندر اور میرے خیالات دوسرے آدمی کے ذہن کے اندر ابلاغ یا ترسیل ہو رہے تھے۔الفاظ کی صورت اختیار کئے بنا۔'' میں نے اپنے آپ کو باور کرانے کی کوشش کی۔تھوڑی دیر کے لئے سفر کو بھول کر شاید اس الجھن کو سلجھانے میں لگ گئی لیکن جلد ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔میں مسافر تھی اور مسافر لمحۂ موجود سے غافل نہیں رہ سکتا۔لمحۂ موجود کے مطابق میں جہاز کے اندر تھی۔جہاز کا اندرون بظاہر تو عام جہازوں جیسا تھا لیکن مجھے بدلا بدلا سا لگا۔مثال کے طور پر اس احساس کو کیا کروں مجھے فضائی میزبان نظر نہیں آئی لیکن یہ کیا ادھر میں نے سوچا اور اُدھر فضائی میزبان ایک ٹرالی

دھکیلتے ہوئے میرے عین داہنے بازو آموجود ہوئی اور بولی ''جوس، سافٹ ڈرنک، پانی''۔

''کافی ملے گی۔۔؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔

''ایک لحظہ انتظار کیجئے براہِ کرم'' اس نے انتہائی ادب سے کہا اور آگے بڑھ گئی۔ پلک جھپکتے میں ایک اور میزبان (اس دفعہ مرد) کافی، چائے، اور دیگر گرم مشروبات کی ٹرالی کے ساتھ حاضر ہو گیا۔ میں نے کالی کافی طلب کی جو مجھے دے دی گئی۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے مسافر نے کسی نامعلوم زبان میں کوئی عجیب سا گرم مشروب مانگ لیا جس کے بخارات سے میری اپنی ایک پسندیدہ خوشبو ''شرارت'' (Mischief) کی مہک آ رہی تھی۔ مجھے بے حد اچھا لگا۔ اچانک سب کچھ معمول کے مطابق ہونے لگا کپتان کی جانب سے بھی کچھ نشر ہوا۔ فضائی میزبانوں نے کچھ ہدایات دیں۔ ٹی وی اسکرین بھی روشن ہوئے اور مسافروں نے اپنے من پسند پروگرام سننے کے لئے کانوں پر ہیڈ فون چڑھا لئے لیکن جہاں تک ابلاغ کا معاملہ ہے اس کا کوئی ثبوت نہ ملا۔ یا تو خیالات بغیر الفاظ کا جامہ پہنے ایک ذہن سے دوسرے ذہن میں منتقل ہو رہے تھے یا پھر لفظ اگر تھے تو ان کی نوعیت بدلی ہوئی تھی۔ بے جسم لفظ۔ مجرّد لفظ۔

''کیا واقعی میں آگہی کا سفر کر رہی ہوں''۔ میں نے اس سے پہلے نہ تو اس طرح سوچا تھا اور نہ ہی اپنے آپ کو سمجھایا تھا۔ میرا ذہن روشن ہو رہا تھا۔ میری فکر کے تاریک گوشوں پر روشنی کی کرنیں سی پڑنے لگی تھیں۔ جہاز پر ابلاغ کی صورت جو مشاہدے میں آ رہی تھی اس نے مجھے اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس عقیدے کو یقین اور ایمان کی حد تک سمجھنے کے قابل بنا دیا کہ ''اللہ جو سوچتا ہے وہ ہو جاتا ہے''۔ وہ اشبدھ ہے اسے لفظوں کی احتیاج نہیں۔ لفظ وقت کے ساتھ بدلتے ہیں۔ وقت کے زیرِ اثر ہیں۔ اللہ وقت کے زیرِ اثر نہیں۔ اس سے قبل میری سوچ اس فقرے پر رکی ہوئی تھی۔ ''سب سے پہلے لفظ تھا'' (Before every thing, there was word) اس طرح سوچتے سوچتے میں اپنی سوچوں کو لئے بھٹکتی پھری۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ جہاز پر کھانا دیا بھی گیا کہ نہیں۔ دھندلی دھندلی یاد میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں نے کھانے کی ٹرالی والی سے ازراہِ مذاق ایسی ڈش مانگی جو ہوائی جہازوں میں مہیا نہیں کی جاتی لیکن اس نے مہیا کر دی اور میں دل ہی دل میں جھینپ کر رہ گئی۔ آخر کار کپتان کی جانب سے یہ اعلان القا ہوا کہ ''ہمارا جہاز اپنی منزلِ مقصود ''آگہی'' کی طیران گاہ پر اترنے والا ہے۔ مبارک ہو۔'' چند لحظوں کے بعد جہاز نے ٹیکسی کی اور میں دوسرے مسافروں کے ساتھ اپنی ہینڈ کیری گھسیٹتی ہوئی زینے کے قریب کھڑے ہوئے جہاز کے کپتان اور عملے والوں کی مسکراہٹوں کے جواب میں اپنے دانت دکھاتے ہوئے جہاز کے زینے سے نیچے اتر گئی۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک لابی (غلام گردش) دکھائی دے رہی تھی۔ ہم سب اس پر پہنچ گئے۔ ہم نے دیکھا کہ دوسری جانب ایک انتہائی خوبصورت اور خاصی لمبی گاڑی کھڑی تھی۔ ہم مسافر اس گاڑی میں سوار ہوئے۔ ایسی گاڑی کسی نے کہاں دیکھی ہوگی۔ مسافروں نے جہاز میں تو ایک دوسرے سے بات کرنے سے پرہیز کیا تھا شاید ہر کوئی اس عجیب و غریب مہم کے زیرِ اثر گنگ ہو گیا ہوگا لیکن اس گاڑی کے اندرون کو دیکھ کر سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور سب ہی ستائشی کلمات کے تبادلے میں لگ گئے۔ یہ بتانا اب شاید غیر ضروری ہو گیا ہوگا کہ بظاہر بات چیت ہو رہی تھی لیکن حقیقت میں غیر لفظی ابلاغ سے کام لیا جا رہا تھا۔ ''یہ بھی تو ممکن ہے ہمارا کھانا، پینا، جہاز، ایئر پورٹ،

بس، فضائی میزبان، کپتان، عملہ، سفر، ظاہر میں کچھ اور باطن میں کچھ اور ہو' کسی برقی جھماکے کے طور پر سوچ کا یہ رخ میرے ذہن میں اچانک وارد ہو گیا جس کو جھٹک کر باہر نکال پھینکنا مجھے بہت مشکل ہوا تا آنکہ ہم '' آ گہی'' کے مرکزی دفتر ''Base'' ''بیس'' پر اتار دیئے گئے۔

مرکزی دفتر یا 'بیس' کی عمارت نہ تو سنگ و خشت سے تعمیر شدہ تھی اور نہ ہی چوبی تھی۔ یہ قیاس کرنا ممکن نہیں کہ اس بیضوی عمارت اور اس کے پہلو میں بنا ہوا ٹاور، لاٹ یا مینار کسی تعمیری مواد سے تشکیل دیا گیا تھا۔ یوں بھی وہ بڑا سا خوبصورت انڈا اور مینار تعمیر شدہ نہیں لگتے تھے۔ صاف طور پر ظاہر ہوتا تھا کہ ان میں سے کچھ بھی تعمیر شدہ نہ تھا۔ بلکہ تخلیق شدہ تھا۔ اس علاقے میں جہاں میں پہنچائی گئی تھی جو کچھ تھا محض خیال تھا۔ احساس تھا یا خیال اور احساس کا آمیزہ۔ جو سوچا گیا اور سوچ سے خلق ہو گیا، عین اسی طرح جس طرح زمین، چاند، ثوابت و سیار اور نظامِ شمسی خلق ہوئے سوچ سے۔ سوچ، جو دُھویں کی طرح ہے اور تسلسل کے ساتھ ایک کے بعد ایک' کہکشانوں کے سلسلے خلق کرتی جا رہی ہے۔

'' آ گہی'' کے مرکز اور مینار کی درمیانی جگہ ایک چھوٹے سے لان کی صورت میں تھی جس کے کنارے پھولوں کے قطعات تھے۔ لان میں جو گھاس کا فرش تھا وہ حقیقی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایک دبیز قالین تھا جس نے میرے پورے وجود کو اپنے آغوش میں سمیٹ لیا۔ کنارے پھولوں پر نظر پڑی تو جسم، ذہن، دل اور روح، خوشبو اور رنگ میں نہا گئے۔'' آ گہی'' کے داخلی دروازے پر چمکدار حرفوں سے لکھا ہوا ایک بورڈ آویزاں تھا۔

''بابِ آ گہی میں داخل ہونے والوں کی واپسی کی ضمانت نہیں دی جائیگی۔ واپسی کا معاملہ انتظامیہ کے حتمی فیصلے سے مشروط ہوگا جن مسافروں کو داخل ہونا منظور نہ ہو وہ مینار کے نیچے والی لابی میں تشریف لے جا سکتے ہیں۔ ان کی واپسی کا انتظام فوری طور پر ممکن ہے۔''

مسافر اس تحریر کو پڑھ کر حیران ہو رہے تھے۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ بورڈ ایک ہی تھا لیکن اس کی تحریر ہر پڑھنے والے کو اس کی اپنی زبان میں لکھی نظر آ رہی تھی۔ مسافر تحریر پڑھ رہے تھے۔۔۔ سوچ رہے تھے۔۔۔ دو دِلے ہو رہے تھے۔۔۔ کسی فیصلے پر پہنچنا کسی بھی مسافر کے لئے آسان نہ تھا۔ مسافروں میں ہر مسافر اپنے انداز میں ردِ عمل کا اظہار بھی کر رہا تھا۔ زیادہ لوگ بے چین بے چین ٹہل رہے تھے۔ کچھ لان پر سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ کچھ وقت اس طرح گزرا پھر فیصلے سامنے آنے لگے۔ بیشتر مسافروں نے مینار کا رخ کیا اور بہت کم باب آ گہی کے نیچے جمع ہوئے۔ اور ایک ایک کر کے اس کے اندر داخل ہو گئے۔

ان داخل ہونے والوں میں سب سے آخری مسافر میں تھی جس نے سب سے آخر میں یہ فیصلہ کیا۔۔۔ میں نے سوچا '' آ گاہ'' ہو کر واپس نہ بھی ہوئی تو کون سا فرق پڑ جائیگا۔ دنیا تو اب بھی چل رہی ہے تب بھی چلتی رہے گی۔ ''

☆☆☆

......ایفل ٹاور......

میری عمر انتیس برس کی ہے۔ پانچ برسوں سے میں اسی موسم میں یعنی ماہ جنوری کے دوسرے ویکینڈ میں برف سے کچھ نہ کچھ بڑا اور قابلِ دید بنا رہا ہوں۔ اس برس کی خاص بات یہ ہے کہ میرا چھوٹا بھائی میرے ساتھ نہیں ہے۔ اس کی کمی کو میرے والد اپنی مرضی اور خوشی سے پوری کررہے ہیں۔ ہر سال برف سے ہم جو بھی بناتے ہیں دنیا اس کی تعریف کرتی ہے لیکن موم مسکرا کر یہی کہتی ہے ''وقت کا ضیاع اور کچھ نہیں'' یہ کہ کر وہ میرے کندھے پر ایک تھپکی دیتی ہے تاکہ میں زیادہ بد دل نہ ہو جاؤں۔ پچھلے سال چھوٹے بھائی کے ساتھ مل کر میں نے ایک قلعہ بنایا تھا۔ برف کا بڑا سا آنکھوں میں کھب جانے والا قلعہ۔ وہ کوئی عام سا قلعہ نہیں تھا۔ پہلی نظر میں کسی جن کی کھوپڑی لگتا جس کے چہرے پر آنکھوں کی جگہ دو بڑے بڑے سوراخ تھے، دوسری نظر میں وہ قلعہ دکھائی دینے لگتا۔ یہ فریبِ نظر قلعے کے پگھل جانے کے بعد بھی دنوں تک لوگوں کا موضوعِ گفتگو بنا رہا۔ میڈیا نے بھی اس کی مناسب تشہیر کی۔ اس سے قبل ہم دونوں بھائیوں نے اسنو مین بنائے تھے، دیو قامت اسنو مین— ہم بھائی جو بھی بناتے دیو قامت بناتے۔ برف سے چھوٹی موٹی چیزیں تو بچّے بھی بنا لیتے۔ برف کی تعمیرات میں شکل و صورت کے ساتھ ساتھ قد و قامت کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ ہماری کوشش کامیاب گئی تھی۔

لوگ ہر سال ہمارے ہنر، فنکاری اور محنت کی داد دینے کے عادی ہو گئے تھے۔ جب والد صاحب نے اس سال کے لئے پیرس کے ایفل ٹاور کا انتخاب کیا تو میں کچھ دیر کے لئے گنگ رہ گیا تھا۔ پہلا مسئلہ تو یہ تھا کہ میں نے ایفل ٹاور دیکھا ہی نہیں تھا۔ جب میں نے اس موضوع پر والد صاحب سے بات کی تو ان کا ردِعمل مجھے عجیب سا لگا۔ انہوں نے کہا:

''تم نے ایفل ٹاور نہیں دیکھا تو اس کا مطلب تم پیرس ہی نہیں گئے''

''یہی تو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں''

''تم آرکیٹیکٹ ہو، ہر آرکیٹیکٹ، آرٹسٹ کو زندگی میں ایک مرتبہ پیرس جانا ہی جانا ہے''

''لیکن ڈیڈ میں تو ابھی تک نہیں گیا— اور''

''اور— کیا— تو پھر کب جا رہے ہو۔ میرے خیال میں تم آج ہی نکل چلو پیرس یاترا پر''

''پیرس پلگریمیج— اب آپ آگے بڑھ کر اس کو ہولی پلگریمیج نہ کہہ دیں (زیارتِ مقدّسہ)۔'' یہ کہہ کر میں ہنس پڑا لیکن جب ڈیڈ کے چہرے پر نظر ڈالی تو وہ جذباتی ہو رہے تھے۔ بھنویں متحرّک اور آنکھوں کی پتلیاں رقصاں تھیں، گال اوپر کو اٹھ آئے تھے، ناک ابھرے ہوئے گالوں میں دب کر رہ گئی تھی، ہونٹ اپنے کناروں کو اونچا اٹھا کر قوس سی بنا رہے تھے۔ ٹھوڑی کی حسین گولائی اور زیادہ حسین ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے مجھے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ میرے ڈیڈ ایک حسین شخص ہیں— قطعی طور پر ہینڈسم شخص! ایک اور بات جس کو میں نظر انداز نہ کر سکا تھا

کہ وہ پیرس کے عاشقوں میں سے تھے۔اس وقت میری سمجھ میں یہ نکتہ آیا کہ ہمارے لونگ روم اور ڈیڈ کی اسٹڈی میں ایفل ٹاور کے چھوٹے بڑے مجسمے کیوں بھرے پڑے ہیں۔سوچ کی اسی موج کے نیچے میرے فیصلے کی ایک زیریں لہر بھی سر اٹھا چکی تھی۔

''ڈیڈ— آپ فکر نہ کریں— میں پیرس گیا یا نہیں گیا میں نے ایفل ٹاور دیکھا یا نہیں دیکھا لیکن اس مرتبہ ہم برف کا ایفل ٹاور بنا کر رہیں گے۔'' میں نے ایک ایک حرف پر زور دے کر اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا۔

''سوچ لو اس میں بڑی مشکل پیش آسکتی ہے۔'' والد مجھ پر ترس کھانے کے موڈ میں آ گئے تھے مگر میں اپنے فیصلے پر اٹل تھا—

''آپ ہیں نا میرے ساتھ — پھر کیا پریشانی ہے۔آپ تو پیرس جا چکے ہیں— آپ نے تو ایفل ٹاور دیکھا ہے۔میں نے ان کو یاد دلایا۔''اس میں کوئی شک نہیں کہ میں پیرس جا چکا ہوں— سچ تو یہ ہے کہ میں پیرس جا کر آیا ہی کب ہوں— ؟ میں تو اس وقت بھی پیرس میں ہوں۔تم نے کسی گم نام شاعر کا وہ مشہور گیت نہیں سنا— ؟

''پیرس میرے اندر ہے
پیرس میرے اندر ہے
اے البیلی دوشیزہ
تو اور تیری یہ دنیا
تیرا جیسس، تیرا کلیسا
ہے تو لیکن باہر ہے
پیرس میرے اندر ہے
پیرس میرے اندر ہے''

والد نے یہ اشعار اتنے لہک لہک کر سنائے کہ تھوڑی دیر کے لئے میں ان کی شخصیت کے اندر اتر گیا۔ایک ایسی شخصیت جس سے شاید میں پہلی مرتبہ متعارف ہو رہا تھا۔میں نے یہ بھی دیکھا کہ میرے والد کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور ان میں تارے چمک رہے تھے۔اس ساری رات میں نے ہوم ورک کرتے گزار دی۔پروجیکٹ سے واقف ہوا۔کاغذی تیاّریاں مکمل کیں۔افسوس کی بات یہ ہے کہ اس عام تعلیم کے زمانے میں میری جہالت کا یہ عالم تھا کہ میں یہ بھی نہ جانتا تھا کہ پیرس میں انقلابِ فرانس کی صد سالہ تقاریب کے سلسلے میں جو بین الاقوامی نمائش ۱۸۸۹ میں منعقد کی گئی تھی اسکی یادگار کے طور پر ایفل ٹاور تعمیر کیا گیا تھا۔اس سلسلے میں سات سو نقشے پیش کئے گئے تھے۔ منصفین نے گستاوَ ایفل کے نقشے کو متفقہ طور پر کامیاب قرار دیا تھا۔اگر چہ اس کے خلاف ۱۳۰۰ اپیلیں دائر کی گئی تھیں۔جن میں بعض اپیل کنندگان دنیائے آرکیٹیکچر اور آرٹ کے عظیم نام تھے۔رات بھر کی محنت سے میں ایفل ٹاور سے سر سے پیر تک واقف ہو گیا تھا۔مجھے تو برف کی مدد سے صرف اس کی شبیہ کھڑی کرنی تھی لیکن میں یہ تک جان گیا تھا کہ ایفل ٹاور میں کونسا لوہا یا فولاد اور کتنی مقدار میں استعمال ہوا

تھا، اسکواسٹر کچرل انجینئرنگ کے کن بنیادی اصولوں کے تحت ڈھالا، جوڑا اور کھڑا کیا گیا تھا۔ اس پر ۱۸۸۷ میں کام شروع کیا گیا اور مقررہ وقت یعنی ۱۸۸۹ میں مکمل کر دیا گیا تھا۔ نقادوں نے اسے وکٹورین اسٹرکچرل ایکسپریشنسٹ کے تحت رکھا۔ جہاں تک اسکی اونچائی کا تعلق ہے یہ ۱۶۵۲ قدمچوں پر مشتمل عمارت ۱۹۳۰ تک دنیا کی بلندترین عمارت کہلائی جاتی رہی ہے۔ اس کو کسی کوہ پیمانے سر بھی کیا اس پر سے پیرا شوٹ کے ذریعہ چھلانگ لگانے کا مظاہرہ بھی ہوا۔ دور بیٹھے بیٹھے میں ایفل ٹاور کو اچھی طرح دیکھ بھی چکا تھا اور جان بھی چکا تھا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی دن چڑھ چکا تھا۔ والدہ جاب پر جا چکی تھیں۔ پہلے تو میرے سامنے صرف ایک مقصد تھا۔ والدہ کو خوش کرنا۔ سرپرائز دینا۔ میں یہ جانتا تھا کہ وہ دومرتبہ پیرس جا چکی تھیں اور مجھے یہ غلط فہمی بھی تھی کہ وہ ایفل ٹاور پر مرتی تھیں۔ یہ جو گھر کے کونے کونے میں ایفل ٹاور کے نمونے کھڑے ہیں، ماں کے ایفل ٹاور سے لگاؤ کے شواہد ہیں۔ مگر اب جب کہ میں کام شروع کرنے جارہا تھا ماں سے بھی زیادہ ڈیڈ میرے خیالوں میں تھے۔ ایفل ٹاور تو ڈیڈ کے اندر تھا اس گیت والے گمنام شاعر کے پیرس کی طرح۔

ہم نے نیلے ڈبّوں سے برف کی تہوں کو جمانے کا کام لیا۔ یہ سب میں نے رات ہی کو طے کرلیا تھا۔ وہ دن اس کام کے لئے بالکل ہی مناسب ثابت ہوا۔ سورج غائب تھا۔ لیکن بارش کے آثار بھی نہیں تھے اور برف نرم تھی۔ اس برفانی ایفل ٹاور کی تعمیر کے لئے ہمیں کہیں دور جانا نہیں پڑا۔ گھر کے سامنے ہی ایک کھلی جگہ موجود تھی وہی موزوں لگی۔ سب سے پہلے ہم نے نیلے ڈبّوں کی مدد سے ایفل ٹاور کی بنیاد تعمیر کی۔ اس کو ممکن حد تک سخت کیا۔ اس پر اپنے نقشوں کے مطابق ایفل ٹاور کھڑا کیا جو سانچے ہم نے تیّار کئے تھے وہ بھی مناسب ثابت ہوئے اس کام میں وقفہ کرنے کی گنجائش نہیں تھی کہ برف کی فطرت کو ہم خوب سمجھتے تھے۔ وقت کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ برف اور وقت میں ازلی دشمنی تھی اور اگر موسمیات والوں کی پیشین گوئی غلط نکلی اور سورج نے اپنے چہرے پر سے نقاب اٹھالیا تو دھوپ وقت سے کہیں زیادہ برف دشمن ہے۔ لیکن موسمیات والوں کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی، سورج نہیں نکلا اور ہم نے اپنا یہ اہرامِ مصر طرز کا ایفل ٹاور چار گھنٹوں کے اندر کھڑا کر دیا۔

کام ختم کر کے ہم اپنے گھر کے اندر چلے گئے۔ ہمارا یہ ایفل ٹاور ہمارے گھر کی کھڑکی سے صاف نظر آ رہا تھا۔ دس فٹ اونچا یہ مینار ہماری کامیابی پر بے حد خوش دکھائی دے رہا تھا۔ شاید وہ اس سبب سے بھی خوش تھا کہ جو لوگ اس کی تعمیر کے دوران اکھٹے ہونے شروع ہوئے تھے اب ایک عظیم مجمعے میں بدل چکے تھے۔ ہمارا ایفل ٹاور اس ہجوم کے درمیان کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ پیرس والا ایفل ٹاور بھی شاید اس وقت اسی طرح مسکرا رہا ہو۔ دروازے کی بجتی ہوئی گھنٹی نے مجھے میری سوچ سے باہر نکالا۔ دروازے کی دوسری جانب میڈیا کی کوئی خاتون کھڑی تھیں۔ اس کے پیچھے کیمرہ سنبھالے ایک فرنچ داڑھی مونچھ والا فوٹو گرافر کھڑا تھا، جس کی ٹانگیں بدن سے کہیں زیادہ لمبی تھیں۔ میری نظریں اس کی داڑھی پر تھیں۔ اور وہ خاتون اپنا تعارف کراتے ہوئے کسی ٹی وی چینل کا کارڈ میری جانب بڑھا رہی تھیں۔ ایسے تجربات سے میں ہر سال ہی گزرتا تھا۔ میں نے والد کو آواز دی، وہ بھی باہر آ گئے۔ ہم دونوں کی برفانی ایفل ٹاور کے ساتھ تصاویر اتاری گئیں اور دونوں سے بات چیت کی گئی اور پھر ــــ تھینک یو بائی بائی ــــ اس کے بعد اس طرح کے اپی سوڈس کئی مرتبہ ہوئے۔ ٹی وی والے، اخبار والے، ریڈیو والے، یہ والے، وہ والے، آتے گئے جاتے گئے ــــ بونجو ــــ ہائی ــــ بائی بائی ٹاٹا ــــ بڑی سردی ہے تاہم ایک

اچّھا دن — آپ باپ بیٹے فرنچ ہیں — فرنچ نہیں۔۔کیوبک سے تعلق ۔۔۔۔۔وہ بھی نہیں تو پھر آپ نے ایفل ٹاور کیوں چنا۔۔۔۔بس یونہی۔۔۔۔۔پھر بھی اس انتخاب کی کوئی وجہ۔۔کوئی رومانس وغیرہ۔۔وہ بھی نہیں۔

اگر میں کہوں ''والد بول رہے تھے'' — ''فولاد کو پانی کرنا''۔

''او —او— کوئی گہری بات —یومین—اوکے۔''

''کیسی گہری بات'' —والد پھر بولے''پیرس کا ایفل فولاد —ہمارا ایفل برف۔۔۔برف۔۔۔برف کب تک؟ آخر پانی۔۔؟''

''فلاسفی۔۔۔پیور فلاسفی۔۔کانگریچولیشن ٹو یو—ٹو یور ایفل۔۔چیرس۔۔۔''

کچھ ہی دیر میں ہم باپ بیٹے تھک گئے۔اندر جا کر ہم نے ایک نوٹس تیّار کیا''ڈونٹ ڈسٹرب''(براہِ کرم ہمیں پریشان نہ کریں)اور دروازے پر چسپاں کر دیا۔کچھ عرصے کے لئے دونوں اندر آرام کرنے لگے—میں تو رات بھر کا جاگا ہوا تھا صوفے پر بیٹھے بیٹھے سو گیا اور اس وقت اٹھا جب ماں جوب سے لوٹی۔۔۔۔اس کے لئے شاید والد نے دروازہ کھولا تھا۔۔میں نے والدہ کو خراب موڈ میں پایا۔میں نے مسکرا کر ماں کو'ہائی موم' کہا۔لیکن اس نے میری مسکراہٹ کو نظر انداز کر دیا اور کرخت لہجہ میں پوچھا۔۔'' یہ ایفل ٹاور کا خیال کس کا تھا —؟''

'' میرا تھا— آپ دو مرتبہ پیرس گئیں،آپنے وہاں کی تعریفیں کیں —سوچا آپ کو سرپرائز دوں— کیا آپ کو پسند نہیں آیا۔۔؟''

اس تمام دوران وہ سوال تو مجھ سے کر رہی تھیں لیکن دیکھ ڈیڈ کی طرف رہی تھیں—میں نے یہ بھی حیرت سے دیکھا کہ ڈیڈ موم کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو غور سے دیکھ رہے تھے— میرے جواب کا نتیجہ اچھا سامنے آیا—موم کے چہرے کا فولاد کچھ کچھ پگھل گیا تھا۔

'' پسند آیا —تم دونوں نے بہت اچّھا بنایا ہے—باہر بھی سب واہ واہ کر رہے ہیں۔مبارک ہو تم دونوں کو—''

چونکہ باہر کے دروازے سے نوٹس ہٹا لیا گیا تھا۔الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے کچھ اور لوگ بھی آئے۔اب کی مرتبہ میں نے والد کے ساتھ والدہ کو بھی بات چیت اور فوٹو میں شریک کر لیا—جس طرح ایفل ٹاور نے ہمارے گھر کے باہر کے ماحول کو خوشیوں کا گہوارہ بنا رکھا تھا اسی طرح گھر کے اندر کا ماحول بھی اگر خوشگوار نہ بھی ہوا ہو تو نیم خوشگوار ضرور تھا۔یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ رات کب آئی۔ڈنر پر گھر کے لوگوں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی شریک تھے۔ایک جوڑے نے رقص بھی کیا۔دیر رات سونے کا موقعہ ملا۔

ایفل ٹاور کی تعمیر کے پیچھے میرا اوّلین مقصد موم کو سرپرائز دینا تھا،اس میں قطعی ناکامی سے دوچار ہوا تھا۔البتہ اگلی صبح ہمارے لئے ایک سرپرائز لے کر چلی آئی تھی اور وہ بھی ایک زبردست المیہ کی صورت میں۔ابھی صبح پوری طور پر ہوئی بھی نہ تھی کہ دروازے کی گھنٹی نے ہم سب کو جھنجھوڑ کر جگا دیا۔دو پولیس افسر باہر کھڑے تھے۔دو تین پولیس گاڑیاں،اور ایک ایمبولینس۔آگے آگے میں،میرے پیچھے ڈیڈ اور ان کے پیچھے موم —جلدی میں صرف جیکٹ جسموں پر ڈالے گھر کے دروازے پر پہنچے تھے۔ہم نے پولیس افسروں کو گھر کے اندر بلا لیا۔اندر داخل ہو کر انہوں نے دھماکہ خیز اطلاع سے بات شروع کی۔رات ایک لیڈی ایفل ٹاور سے لپٹ کر مر گئی تھی۔ہمیں باہر جا کر اس کی باڈی کو

شناخت کرنا تھا۔ابھی تک اس کے بارے میں جومعلومات حاصل ہوئی تھیں اسکے مطابق :۔

مرنے والی کا نام مارتھا فرامرز تھا۔اس کی عمر40، 45 برس کی تھی چند ہی دن ہوئے پیرس سے آئی تھی ۔ہم تینوں نے خاموشی سے یہ سب کچھ سنا۔ پولیس افسروں سے اجازت لے کرسردی کا لباس پہنا۔باڈی کوہسپتال لے جانے کی تیاّری ہورہی تھی ۔ہم تینوں کوایمبولنس میں چڑھ کراسے دیکھنا پڑا۔جب ہم نیچے اترے تو پولس افسر نے ہمارا بیان قلمبند کیا۔میں نے یہی کہا کہ مرنے والی کواس سے قبل میں نے کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی پیرس جانے کا اتفاق ہوا— موم اور ڈیڈ نے کیا لکھوایا یہ مجھے اس وقت معلوم نہ ہوسکا۔البتہ اس خاتون کی موت کا سبب میں نے پولس افسراورموقع ملنے پر پیرامیڈ سے معلوم کرنے کی کوشش کی پولس والے نے کہا ''سردی—ایکسپوژر'' پیرامیڈ نے بتایا ''نمونیہ —زبردست نمونیہ''۔پھر وہ سب ہسپتال چلے گئے ۔یہ سب بہت جلد ہوگزرا—یوں تو پیرامیڈ نے اس کو برقی جھٹکے دے کرحتمی کوششیں کرچھوڑی تھیں لیکن ہسپتال میں بھی پہنچانا ضابطے کے مطابق ضروری تھا۔

جب میں گھر میں داخل ہواتو ماحول سوگوار ہونا ہی تھا لیکن قدرے ناقابل فہم ہورہا تھا— میں نے دیکھا کہ موم فیملی روم میں اکیلی بیٹھی تھیں ۔وہ صوفے پر نیم درازسی تھیں اوران کی آنکھیں چھت کوتک رہی تھیں ۔ایک اپنے آپ کوسکیڑنے اور سمیٹنے والی ہستی— ضابطے کے اندر رہنے والی ہستی اپنے آپ کو پھٹ پڑنے سے روک رہی تھی ۔میں چاہتا تھا کہ ان سے پوچھوں کہیں وہ اس مرنے والی کو جان کربھی انجان نہ بن رہی ہوں ۔ان سے یہ توقع رکھی جاسکتی تھی ۔اپنے اندران سے سوال کرنے کی ہمّت نہ پا کر میں فیملی روم سے نکل رہا تھا کہ موم کے الفاظ میری سماعت سے ٹکرائے''اپنے ڈیڈکواس کے حال پرچھوڑ دو۔وہ اس کتیا کو یادکر کے رورہا ہوگا۔''

میں نے موم کی تاکیدان سنی کردی اور زینہ چڑھ کر ڈیڈ کے کمرے تک پہنچا۔دروازہ اندر سے بند نہ تھا۔ میں نے ناک کیا۔۔کوئی جواب نہیں ملا۔دومرتبہ دروازہ ٹھک ٹھک کرنے کے بعد میں کمرے کے اندر دبے پاؤں داخل ہوا۔میری نیت یہ تھی کہ اگر ڈیڈ کوبستر پر لیٹا پاؤں گا تو چپ چاپ الٹے قدموں واپس لوٹ جاؤں گا۔لیکن وہ بستر کے بائیں گوشے میں پڑی ہوئی کرسی پراس طرح بیٹھے تھے کہ جیسے میز پر جھک کر کچھ لکھ رہے ہوں۔

''تم ہو۔۔۔ مجھے پتہ تھا تم ضرورآؤ گے۔تمہاری موم نیچے کیا کررہی ہے—''؟''میں جانتا ہوں وہ چھت کا مطالعہ کررہی ہوگی ۔ایسے وقتوں میں وہ یہی کرتی ہے؟''میں نے دیکھا موم کے خیال کے عین مطابق ڈیڈا کیلے بیٹھ کررورہے تھے۔ان کی آنکھوں سے صاف پتہ چل رہا تھا۔

''موم اورڈیڈ دونوں ایک دوسرے کوکس حدتک جانتے تھے ۔ایک دوسرے کے ردِّعمل کے بارے میں دونوں کے اندازے کس قدر درست تھے۔'' میں نے سوچا اور بولا۔۔

''موم فیملی روم میں بیٹھ کرچھت کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں ۔لیکن آپ۔۔آپ کیا کررہے ہیں۔۔کیا آپ رورہے ہیں ڈیڈ؟''

''تم سے کس نے کہا۔۔؟

''موم نے ''

''موم نے اور کیا کہا ۔۔۔؟''

''موم کی بات چھوڑیئے۔۔۔۔یہ بتایئے کیا آپ متوفی کو جانتے تھے۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔جانتا تھا۔۔۔ اتنا ہی جتنا میں پیرس کو جانتا تھا۔۔۔بھول گئے وہ گیت''

''پیرس میرے اندر ہے''۔''وہ میرے اندر تھی۔۔۔وہی تو تھی میری پیرس۔۔۔پیرس میرا نہیں ہوسکا۔۔۔وہ میری نہ ہوسکی۔۔۔۔ہم سب کے راستے جدا تھے۔''

'' ہم سب کے۔۔۔۔؟''

''ہم سب سے مراد، وہ، میں، پیرس،اور ایفل ٹاور۔۔۔ایفل ٹاور اس کی سائیکی کا ایک حصّہ تھا۔اس نے ایفل ٹاور کے ریسٹوران میں مجھے ڈنر دیا۔۔۔بلِ آیا تو پتہ چلا۔۔۔۔ایفل ٹاور کا وہ ریسٹوراں دنیا کا مہنگا ترین ہوٹل تھا۔۔۔۔ایک پاگل ہی وہاں ڈنر دے سکتی تھی۔اسے عشق تھا ایفل ٹاور سے۔۔۔ ہر شام وہ سورج ڈھلنے سے کچھ دیر قبل ایفل ٹاور کی چھت پر جا پہنچتی اور پیرس کا نظارہ کرتی۔۔پیرس کا نظارہ کرنے کا موزوں ترین وقت۔۔۔۔۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ نری پاگل تھی۔۔۔۔اور مری بھی پاگل کی موت۔''

یہ کہہ کر ڈیڈ چیخ چیخ کر رونے لگے۔میں نے ڈبے سے ٹشو نکال کر ڈیڈ کو دیا اور کمرے سے نکلتے ہوئے دروازہ اچّھی طرح سے بند کر دیا۔

......فلاور بُکے ......

''**ایکسکیوزمی**۔ یہ آپ کے پھول گر پڑے تھے''

''یہ گرے نہیں۔ میں نے پھینکے تھے۔ میں ان سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔''

''پھینکنے اور جان چھڑانے کے لئے گاربیج کرنا چاہئے۔''

''میری طرف سے آپ کوڑے دان میں ڈال دیجئے۔''

''نہیں۔ سوری۔ آپ کی چیز آپ ہی ڈالیں۔''

''لیڈی۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

''میں سارہ فریز رہوں۔ اور تم؟''

''میں صرف ایک اجنبی۔''

''بچپن سے مجھے اجنبیوں سے ڈرایا گیا ہے۔ خیر تھوڑی دیر کے لئے میں پرانی نصیحت بھول جاتی ہوں۔ یہ فلاور بُکے بہت پیارا ہے۔ تم اس سے کیوں جان چُھڑا رہے ہو۔؟''

''سیدھی سی بات۔ میں اس میں اب کوئی دلچسپی محسوس نہیں کرتا۔''

''کیس عجیب بات۔! میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں تم نے صرف چند منٹ قبل اسی بنسلے روڈ کے پچھلے چوراہے پر یہ بُکے خریدا ہے۔ اتنے کم وقت میں ایسا کیا ہو گزرا کہ تم نے اسے پھینک دیا''

''میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ مجھے اب اس بکے سے کچھ لینا دینا نہیں۔''

''اس بُکے سے کچھ لینا دینا نہیں۔ اپنے ہاتھ سے کوڑے دان میں ڈالنا بھی نہیں۔ میں تم پر ہنس سکتی تھی لیکن میں ایسا نہیں کروں گی البتہ ہم دونوں کو یہاں 'یوٹرن لینا پڑے گا۔'' یہ کہہ کر لڑکی اپنے قدم روک لیتی ہے، مرد اس کی اس حرکت سے حیران سا ہو جاتا ہے لیکن لڑکی کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر خود بھی اپنے قدم روک لیتا ہے اور رسمی انداز میں کہتا ہے۔''لیکن مس سارہ فریزر — تمہارا وقت''

''میرے وقت کی تم فکر نہ کرو۔ اس کو میں تمہارے نہ سمجھ میں آنے والے رویّے کی نذر کرتی ہوں۔ بشرطیکہ تمہیں قبول ہو'' سارہ یہ کہہ کر پلٹ جاتی ہے۔ مرد بھی اس کی تقلید کرتا ہے اور دونوں الٹے قدموں چلنے لگتے ہیں۔ لڑکی جو مرد کا سائڈ واک پر گرایا ہو بُکے اپنے ہاتھوں میں پکڑے تھی، مرد کے ہاتھ میں تھما دیتی ہے۔ اس مرتبہ لڑکی کے رویّے میں خود اعتمادی جھلک رہی تھی لیکن مرد ایسا لگتا تھا جیسے ٹرانس (سحر زدہ) میں ہو۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ دونوں ہی چُپ تھے یا دونوں ہی بول رہے تھے بنا شبد ھ۔ جلد ہی بنسلے روڈ کا وہ چوراہا آ گیا جہاں

ایک گل فروش بڑھیا سے مرد نے پھولوں کا بُکے خریدا تھا۔ دونوں کی آنکھیں بڑھیا کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ بڑھیا نے دونوں کو آنکھ ماری۔ اس دوران اس کا منہ بھی کھُلا اور مصنوعی دانت بھی چمکے۔ مرد ہونقوں کے انداز میں بڑھیا کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ جبکہ عورت نے دبی دبی مسکراہٹ بڑھیا کی جانب اچھال دی۔ سارہ فریز ر اور بے نام مرد ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہوئے بنسلے روڈ کے چوک کی دوسری جانب والی روڈ جس پر ریس روڈ کی تختی لگی ہے، مُڑ گئے۔ مرد نے سارہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہلکے سے اس کی دائیں ہتھیلی کو دبایا۔ سارہ چلتے چلتے رک گئی اور بولی۔ ''کہو کیا کہنا ہے۔''

''کچھ نہیں۔ بس یونہی''

''سارہ فریز ر کوئی کام — بس یونہی نہیں کرتی۔''

''پھر کس طرح کرتی ہے۔؟''

''پورے اعتماد کے ساتھ — اور — دل و جان سے۔''

''میں تو بس یہ جاننا چاہتا تھا کہ سارہ فریز ر ایک اجنبی کے ساتھ کہاں جا رہی ہے۔۔؟''

''تم نے غلط سوال کیا ہے مسٹر اجنبی — سارہ فریز ر اجنبی کے ساتھ نہیں جا رہی ہے بلکہ معاملہ برعکس ہے۔ اجنبی سارہ فریز ر کے ساتھ جا رہا ہے۔''

''چلو مان لیا (اجنبی یہ کہہ کر ہنسا) اب یہ بھی بتا دو کہ بچارا اجنبی سارہ فریز ر کے ساتھ کہاں جا رہا ہے۔؟''

''دنیا کے آخری سرے پر جہاں آسمان زمین سے مل جاتا ہے۔''

''مائی ڈیر سارہ فریز ر۔ دنیا گول ہے۔ اس کا کوئی سرا نہیں ہے اور ہاں آسمان کسی بھی جگہ زمین سے نہیں ملتا۔؟''

''مسٹر اجنبی۔ تم کون ہو۔؟ آسمان — یا — زمین —؟''

''اس سے قبل کسی نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا۔ مجھے سوچنا پڑے گا لیکن پہلے تم بتاؤ — تم کیا ہو — آسمان یا زمین —؟''

''میں زمین ہوں۔ اب اگر تم نے جواب سوچ لیا ہو تو بتاؤ۔ تم کیا ہو۔؟''

''میں۔ میں آسمان ہوں لیکن ایسا جو زمین سے ملتا ہے۔''

''وہ کس طرح۔؟''

'جھُک کر۔''

''تو پھر جھکو نا۔!''

مرد نے سارہ کی یہ بات سن کر ایک لحظہ کے لئے کچھ سوچا اور مسکراتے ہوئے اس کے آگے جھک گیا۔ سارہ نے اس کا بازو تھام کر ایک بار پھر اس کو سیدھا کھڑا کر دیا۔ مسکرائی اور بولی۔

''تم پوچھ رہے تھے۔ میں تمہیں کہاں لے جا رہی تھی لیکن اب تمہارے سامنے تین آپشنز (OPTIONS) رکھتی ہوں۔ پہلا وہی

چلڈرن پارک کی بنچ پر بیٹھ کر باتیں، دوسرا کافی ہاؤز اور تیسرا میرے اپارٹ منٹ میں گپ شپ۔۔۔۔ میں یہاں سے بالکل قریب ایک اپارٹ منٹ بلڈنگ میں رہتی ہوں۔''

''ایسی صورت میں تیسرا آپشن مجھے مناسب لگتا ہے۔''اس مرحلے پر سارہ فریزر نے اچانک سنجیدگی اختیار کرلی، غیر معمولی سنجیدگی اور کہا''اس آپشن کے ساتھ کچھ شرائط ہیں۔''

''وہ کیا۔؟''اجنبی نے پوچھا۔

''تم اپنا تعارف کراؤ گے۔شراب تو شراب بیئر بھی نہیں مانگو گے۔ مجھ سے نہیں لپٹو گے۔ میرا بوسہ نہیں لو گے۔۔۔۔ہوائی بوسہ بھی نہیں اور سب سے اہم شرط۔۔۔اس بکے کے بارے میں پورا سچ بتانا پڑے گا۔۔۔'' سارہ نے اجنبی کو کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے لیکن میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس کے باوجود بھی تم مجھے اپنے گھر نہ لے جاؤ گی تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ مجھے تمہاری خوشی چاہیئے۔''اجنبی نے نرمی سے جواب دیا۔ سارہ فریزر نے پہلی مرتبہ دلی توجہ سے دیکھا۔ کسی نے پہلی مرتبہ اس کے اپارٹمنٹ کو گھر کہا تھا۔ اجنبی کی آواز میں بھی کچھ تھا۔ کچھ خاص جس پر اعتماد کیا جاسکتا تھا۔ اچانک وہ اجنبی سے اپنا بن گیا تھا۔

''تو چلو ۔۔۔ ہم اپنے گھر چلتے ہیں۔'' سارہ فریزر بولی۔ دونوں میں اور تم سے۔ہم ہو گئے اور ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ سارہ فریزر کا ہاتھ اجنبی کے ہاتھوں سے لپٹنے کے لئے بڑھا جس کو روکنے میں اسے قوت ارادی استعمال کرنی پڑی۔

راستے ہی میں اجنبی نے اپنا نام بتا دیا۔ اس کا نام جان اوبرین تھا۔ پھولوں کے بارے میں اس نے بتایا کہ پھول وہ اپنی استاد کے لئے، لے جارہا تھا جو بڑی عمر کے باعث نرسنگ ہوم میں داخل کرادی گئی تھیں۔ نرسنگ ہوم چند قدم دور تھا کہ وہ جانے کے بارے میں دو دِلا ہو گیا۔ جانے کا ارادہ ہی ترک کردیا اور جھلاہٹ میں پھول پھینک دیے۔ نرسنگ ہوم والوں نے پچھلی مرتبہ بہت روکھا برتاؤ کیا تھا اور اس کو تنبیہ بھی کی تھی کہ آئندہ نہ آئے۔ اس سے قبل جب بھی وہ اس شہر میں آتا تو اپنے بچپن کی اس استاد کو ضرور سلام کرنے جاتا۔ ان دنوں وہ ایک نوکرانی کے ساتھ اپنے گھر میں رہا کرتی تھیں پھر وہ ہوش کھو بیٹھیں اور نرسنگ ہوم میں پہنچادی گئیں۔''اور تم نے ان کو اپنے ذہن اور دل سے باہر نکال پھینکا'' سارہ فریزر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''تمہارا قیاس غلط ہے۔ میں نے ان کے لئے کچھ مناسب اقدامات کرلئے ہیں لیکن چند ایک قانونی پابندیوں اور رکاوٹوں کو دور کرنے میں وقت لگ رہا ہے۔'' جان اوبرین نے سمجھایا۔

''سوری۔ میں تمہاری ذاتی زندگی میں دخل اندازی کررہی ہوں۔'' سارہ شرمندگی سے بولی۔

'' معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ۔ میں تو چاہتا ہوں ۔ سارہ۔تم میری زندگی میں مزید دخل اندازی کرو بلکہ پوری کی پوری داخل ہو جاؤ۔'' جان نے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تم جانتے بھی ہو۔تم کیا کہہ رہے ہو؟ اگر میں تمہاری زندگی میں پوری کی پوری داخل ہوگئی تو جانتے ہو کیا ہوگا۔'' کیا؟ سارہ نے جان کا مضحکہ اڑانے کے انداز میں سوال کیا۔

''جانتا ہوں'' جان نے سنجیدگی سے کہا۔''تم میری ہو جاؤ گی ہمیشہ کیلئے''

''مسٹر اوبرین۔تم غلط سمجھ رہے ہو'' سارہ ہنستے ہوئے بولی ''میں تمہاری ہوں یا نہ ہوں۔تم میرے ہو جاؤ گے۔''

''تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو مس فریزر۔وہ تو میں پہلے ہی ہو چکا'' جان اوبرین نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔اس وقت وہ دونوں بلڈنگ میں پہنچ چکے تھے۔سارا نے انٹر کام میں بات کر کے راستہ کھلوایا۔دوسرے لمحے وہ سارہ کے ایک کمرے کے اپارٹ منٹ کے دروازے پر تھے۔ سارہ نے چابی نکالی لیکن جان نے اسے دروازہ کھولنے نہیں دیا اور نہایت مہذب انداز میں چابی مانگنے کے لئے ہاتھ آگے کیا۔سارہ یکبار گی چونک سی گئی۔اس نے سوچا ''کیا جان۔واقعی اتنا شائستہ ہوسکتا ہے یا محض اداکاری ہے۔'' زبان سے کچھ کہے بغیر اس نے چابی جان کے ہاتھ میں رکھ دی۔جان نے بڑھ کر دروازہ کھولا اور ادب سے ایک طرف ہو کر سارہ کو پہلے اندر داخل ہونے کا موقع دیا۔جان اوبرین کے اس انداز سے سارہ کے بدن میں انجانی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔اندر پہنچ کر اس نے جان کو اندر آنے کی دعوت دی۔اس کے اندر آتے ہی سارا نے دروازہ بند کر دیا۔اپارٹ منٹ کے اندر کی دنیا جلد ہی باتوں سے آباد ہوگئی۔سارہ فریزر تو تھی ہی بولنے والی لیکن جان اوبرین بھی کم کم بولتا رہا۔سارہ نے البتہ یہ محسوس کر لیا کہ جان نے اسے دیکھنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔اسے اچھا تو لگا لیکن وہ اندر ہی اندر شرماتی بھی رہی اگر چہ اپنے اس جھینپنے کو جان پر ظاہر ہونے نہیں دیا۔یہ اور بات وہ زیادہ سے زیادہ اِدھر اُدھر دیکھ کر جان اوبرین کی فِدا ہونے والی آنکھوں کو فدا ہونے کا موقع فراہم کرتی رہی۔

وقت دبے پاؤں گزرتا رہا۔سارہ نے جان کی چپس اور سوفٹ ڈرنکس سے تواضع کی۔کافی کو جان نے منع کر دیا۔جان نے سارہ سے فاصلہ رکھا۔اس کو چھوا بھی نہیں البتہ عین جاتے وقت اس نے سارہ سے کہا۔

''غصہ مت ہونا مس فریزرا گر میں آپ سے ایک درخواست کروں۔''

''غصہ ہونے والی بات ہوگی تو میں ضرور غصہ کرونگی۔اور کیوں نہ کروں'' سارہ فریزر نے فوری جواب دیا۔اس وقت تک وہ جان اوبرین کے حسنِ سلوک سے نہال ہو رہی تھی۔دُکھی ہوگئی۔وہ سوچ رہی تھی۔''اب جاتے سمے یہ کُھلے گا اور اس کی کھال میں چھپا ہوا ہوس کار مرد بھیڑیا باہر آجائے گا سب کے سب مرد ایک سے کیوں ہوتے ہیں۔؟۔''

''میں جو درخواست کرنے والا ہوں اس سے تمہیں شدید غصہ آنا متوقع ہے لیکن میں تمہیں غصہ دلانا نہیں چاہتا۔میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔تم ایک نایاب ہیرا ہو جسے خدا نے میری آنکھوں کے سامنے کر دیا ہے۔تمہیں اختیار ہے کہ تم میری درخواست مسترد کر دو لیکن پلیز غصہ مت کرنا'' جان اوبرین کی باتوں اور لہجے کے خلوص سے سارہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور قدرے پیار سے بولی۔''اچھا۔اب بتاؤ گے بھی۔آخر تم کیا چاہتے ہو'' سارہ لاچار سی ہوگئی تھی۔اس کی نظریں نیچی تھیں۔

''میں تمہیں ایک لمحے کیلئے بالکل برہنہ دیکھنا چاہتا ہوں۔'' جان اوبرین نے کہہ دیا جو کہنا تھا اب یہ تجزیہ کرنا مشکل تھا—خود اس کے لئے بھی کہ یہ فقرہ اس کے اندر کے ضدّی بچے نے ادا کیا تھا یا حسن پرست مرد نے یا پھر تخلیق حسن سے وابستہ فنکار نے۔

''کتنی لغویات۔بے ہودہ—نا قابلِ سماعت'' سارہ کی زبان سے الفاظ بمشکل ادا ہو رہے تھے۔جان اوبرین نے ہتھیلی کے اشارے

سے روک دیا اور بولا۔

’’میں اپنی درخواست واپس لیتا ہوں۔ مجھے غصّے کے بغیر رخصت کرو۔ پلیز‘‘ یہ کہہ کر جان دروازے کی جانب بڑھ گیا۔’’رکے رہو تھوڑی دیر اور جب تک میں نہ کہوں میری جانب مت پلٹنا‘‘ سارہ کی آواز نے اس کے بڑھتے قدم روک دئے۔ وہ جہاں تھا وہیں رکا رہ گیا دروازے کی جانب منہ کئے ہوئے۔ جب سارہ نے اسے آواز دی—

’’جان اوبرین اب تم پلٹ سکتے ہو‘‘ تو وہ پلٹا۔ اس کے سامنے حسن و جمال کا ایک ایسا شاہکار کھڑا تھا جس کو خدائے تعالیٰ نے بڑی فرصت سے بنایا تھا۔ اس خدا نے جو بقول اہلِ عرب’’ اللہ جمیلٌ ویحب الجمال ‘‘(اللہ حسن ہے اور حسن کو عزیز رکھتا ہے) سارہ فریزر آنکھیں بند کئے، بالکل برہنہ کھڑی تھی جیسے سیپی سے نکلا ہوا کوئی تازہ موتی۔ چند لمحوں کے بعد اس مجسمۂ حسن کے نازک لب حرکت میں آئے۔’’بس اب تمہاری خواہش پوری ہوگئی۔ اب تم دروازے کی جانب اپنا رخ کرلو تو میں اپنی آنکھیں کھولوں— مگر خبردار جو تم نے میرے بدن کو چھو کر اسے میلا کیا۔‘‘

’’میری ایک اور درخواست ہے مس فریزر لیکن اس کے لئے تمہیں اپنی آنکھیں کھولنی پڑیں گی۔‘‘ جان ملتجیانہ لہجے میں بولا۔

’’بس۔ بس اب بہت ہوگیا۔ اب تمہاری ایک نہ سنونگی۔ میرے اپارٹمنٹ سے فوراً نکل جاؤ۔‘‘ سارہ غیض میں آکر بولی اور اس کی آنکھیں آپ ہی آپ کھل گئیں لیکن وہ حیران رہ گئی جب اس نے جان کو دیکھا جو اس کے قدموں کے قریب ایک گھٹنے کے بل بیٹھا اسے پروپوز کررہا تھا۔

’’مس سارہ فریزر—! کیا تم مجھ سے شادی کروگی۔؟‘‘ سارہ اپنے خوبصورت برہنہ جسم کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ کچھ دیر تک جان کو دیکھتی رہی اور پھر دھیمے لیکن پیار بھرے لہجے میں بولی۔’’یس‘‘ لیکن اس کا ذہن خدشات سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں ایک سانپ پھن پھیلائے کھڑا تھا۔ ڈسنے کے لئے تیار۔ اس کو ڈر تھا کہ شاید جان اوبرین نے اس کا جسم حاصل کرنے کے لئے یہ انوکھی چال چلی تھی جان نے اس کی زبان سے ’یس‘ سنا۔ اس کے قریب آیا۔ سارہ نے غیر یقینی انداز سے اسے دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں سارہ کا اتارا ہوا لباس تھا۔ بدگمانی کی شدت میں سارہ یہ بھی دیکھ نہ پائی‘ جان نے کب اس کے اتارے ہوئے کپڑے سمیٹے اور کب اس کی جانب آیا۔؟۔ سارہ جان کے ہاتھوں سے کپڑے لے کر اندر چلی گئی، جان کو رکنے کے لئے کہتے ہوئے۔ وہ جلد ہی اپنے موتی سے بدن کو کپڑوں میں لپیٹ کر باہر آئی۔ جان کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر اس کو دروازے تک پہنچایا۔ اس سے لپٹی۔ اس کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے چھوا۔ بلند آواز میں خدا حافظ کہا اور اس کے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ یہ نہ جانتے ہوئے کہ جس جان اوبرین کو اس نے خدا حافظ کہا تھا وہ اس کا ہونے والا شوہر ہونے کے ساتھ نامی گرامی اور کامیاب مصور (جے۔ بی) تھا۔’’وہ اپنا بگّے بھول گیا‘‘ اس نے ایک لحظے کیلئے سوچا۔

جان اوبرین کے رخصت ہونے کے بعد سے دونوں کی شادی ہونے تک سارہ گاہے گاہے یہ تصور کر کے ہنستی رہی— ’’وہ ننگی کھڑی ہے اور جان اُسے پروپوز کررہا ہے۔‘‘

☆☆☆

......سانپ، سایا اور خواب......

''اب تم آئی ہو تو میرا خواب سنتی جاؤ'' میری خالہ زاد بہن زاہدہ (جو کراچی سے باہر زاہداں کہلاتی تھی) نے مجھ سے کہا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ زاہدہ اپنے کسی خواب میں مجھ کو شریک کر رہی تھی۔ میرے اس وقت کے تجربے کے مطابق وہ انتہائی سیکریٹیولٹر کی تھی۔ میں ٹھٹھے سے آ کر اپنی خالہ کے گھر مقیم ہو گئی تھی۔ آگے پڑھائی جاری رکھنے کے لئے میرا یہی ایک راستہ تھا۔ میرے بزرگ مجھے ٹھٹھے کے اکلوتے کالج میں نہیں داخل کر سکتے تھے۔ اس کالج کے پرنسپل ہمارے خاندانی اور موروثی دشمنوں سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے جب آگے پڑھنے کی ضد کی تو مجھے کراچی خالہ کے ہاں بھیج دیا گیا تا کہ میں کراچی میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھ سکوں۔ مجھے خالہ زاد بہن زاہدہ کے کمرے سے متصل ایک کمرہ دیا گیا۔ اس طرح میں اور زاہدہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے، اور جدا جدا بھی رہنے لگے۔ یہ مناسب بھی ثابت ہوا۔ زاہدہ میری ہم عمر ہونے کے باوجود مجھ سے ہمیشہ ایک فاصلے پر رہنے والے مزاج کی لڑکی ثابت ہوئی۔ یوں بھی خالہ کے وسیع و عریض بنگلے میں کمروں کی کمی نہیں تھی۔ مجھے خوابوں کے بارے میں بس اتنا ہی معلوم تھا کہ خواب دو طرح کے ہوتے ہیں۔ سہانے Sweet dreams۔ لڑکیاں تکئے کے غلاف پر کاڑھ کر ایک دوسرے کو تحفے میں دیتی ہیں۔ دوسرے ڈراؤنے خواب Night mare۔ ہاں یاد آیا کہ میں نے کسی ادبی رسالے میں فرائیڈ اور یونگ پر مختصر مضمون پڑھا تھا۔ اس مضمون میں خوابوں کا رشتہ انسان کے تحت الشعور سے جوڑ کر بہت کچھ کہا گیا تھا۔ مجھے کچھ یاد رہا۔ کچھ بھول گئی۔ بڑی بوڑھیوں سے جو سنا تھا وہ یہ کہ بعض خوابوں کی تعبیر الٹی ہوتی ہے۔ اور یہ نصیحت کہ کوئی خواب سنائے تو برے سے برے خواب کو اچھا کہنا چاہئے۔ میں خواب بہت کم دیکھتی ہوں اور دیکھتی ہوں تو بھول جاتی ہوں۔ البتہ میں نے لڑکیوں کے خواب بہت سنے اور مزے لے لے کر سنائے ہوئے خوابوں کے مزے بھی بہت لوٹے۔ زاہدہ نے خواب سنانے کی بات کی تو میں جھٹ تیار ہو گئی۔ وہ بیڈ پر بیٹھی تھی میں اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی وہ شوخی اور مسکراہٹ سے خالی تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ زاہدہ کا خواب پہلے گروہ سے نہیں ہو سکتا۔ میں اس کے خواب سے بغیر سنے ڈرنے لگی۔ بچپن میں جنوں، بھوتوں اور چڑیلوں سے......اوران کے خوابوں سے بہت ڈرتی تھی۔۔ بعد میں آدمیوں سے ڈرنے لگی۔۔۔

زاہدہ نے اپنے خواب میں سانپ دیکھا جس نے اس پر جھپٹا مارا لیکن کاٹا نہیں۔ کاٹنے کے بجائے اس نے زاہدہ کے پورے بدن کو اپنی کنڈلی میں لے لیا۔ زاہدہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ وہ اپنی جگہ سے ہلکی سی جنبش کرنے کے قابل بھی نہ رہی تھی۔ وہ نہ تو کمرے سے باہر جا سکتی تھی اور نہ ہی کسی کو آواز دے سکتی تھی۔ جب اس نے چیخ ماری تو اس کی چیخ بھی اس کے اپنے حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ اپنا خواب اس حد تک بتا کر رہ چپ ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ وحشت زدہ ہو رہا تھا۔ آنکھیں جیسے باہر ابلی پڑ رہی تھیں۔ اس کا چہرہ اس کے خواب کی گواہی دے رہا تھا۔

کچھ دیر پورے کمرے میں ایک سکوت طاری رہا بلکہ یہ کہنا بہتر ہو گا کہ زاہدہ کا خواب طاری رہا۔ پھر میں نے ہی اس سکوت کو توڑا اور بولی۔

’’وہ سانپ اتنا بڑا تھا کہ اس نے تم کو سر سے پیر تک لپیٹ لیا‘‘۔

’’جب وہ مجھ پر جھپٹا تو چھوٹا تھا لیکن میرے بدن سے چھوتے ہی وہ لمبا ہونا شروع ہوا اور سر سے پاؤں تک مجھ سے لپٹ گیا۔ اس دوران میں آیت الکرسی کا ورد کرنے کی کوشش کرتی رہی اور حلق سے آواز نکالتی رہی۔ لیکن نہ تو کچھ پڑھ سکی اور نہ کسی کو آواز دے سکی۔

’’پھر‘‘

’’پھر میں نے ہمت سے کام لیا اور اس کی گردن پکڑ لی۔ جیسے ہی اس کی گردن میرے ہاتھ میں آئی وہ چھوٹا ہو گیا۔ میں اس کی گرفت سے آزاد ہو گئی اور وہ میری گرفت میں آ گیا۔ میں نے دیکھا میرا حلق بھی کھل گیا۔ میں کسی کو آواز بھی دے سکتی تھی لیکن میں نے کسی کو آواز نہیں دی۔ اور اس کو میز کی درمیانی دراز میں ڈال کر دراز کو بند کر دیا‘‘۔

’’میں نے زاہدہ کا خواب سنا اور اس کے گالوں کو چھو کر مسکرائی‘‘۔

’’تم مسکرا رہی ہو اتنے بھیانک خواب پر‘‘۔

’’مائی ڈیئر زاہدہ تم کو بھی ہنسنا، مسکرانا چاہئے‘‘۔

اصل جواب سے گریز کرتے ہوئے میں نے زاہدہ کو جواب دیا۔ اس سوال کا جواب جو میرے ذہن میں موجود تھا وہ تھا کہ فرائڈ کے قول کے مطابق ’’خواب میں سانپ جنس کی علامت ہے‘‘۔ یہ جواب میں زاہدہ کو نہیں دینا چاہتی تھی۔ مجھے ڈر تھا وہ کہیں اس کا برا نہ مانے اور میں اس کو یہ بھی بتانا نہیں چاہتی کہ نانی اماں کے قول کے مطابق ’’سانپ دشمن کی علامت ہے‘‘ اس صورت میں وہ نجانے کس کس کو اپنا دشمن سمجھ لیتی۔

’’او کے۔ میں نے مسکرا لیا۔ لیکن خواب میں ہنسنے مسکرانے کی کیا بات ہے‘‘۔

زاہدہ نے مجھے اپنے خوبصورت دانت دکھاتے ہوئے پوچھا۔ اس کے دانت ہی نہیں، اس کا منہ، ہونٹ، ناک، آنکھیں سب ہی خوبصورت ہیں۔ بلکہ وہ ہے ہی سر سے پیر تک حسین و جمیل۔ میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر ہلکے سے دبایا۔ اور کرسی پر پہلو بدل کر بولی۔

’’خواب تھا تو جان لینے والا۔۔ بھیانک سچ مچ۔۔ نائٹ میر لیکن اس کا انجام بہت اچھا تھا۔۔ تھا نا۔۔ تو نے سانپ پر قابو پا کر قید بھی کر لیا تھا۔۔ پھر خواب اچھا ہوا کہ برا۔۔‘‘ ’’اگر میرا خواب تجھے پسند آیا ہے تو آج رات میں اسے تیری طرف روانہ کر دوں گی تو اس کے مزے لینا‘‘

ضرور ضرو۔۔ میں تو تیری ہر چیز (Share) شیئر کر لوں، کمرہ بھی۔۔ لیکن تو ہی الگ تھلگ رہتی ہے‘‘۔

’’میں ایک چیز تجھ سے شیئر (Share) کرنا چاہوں گی‘‘۔

’’وہ کیا۔۔؟‘‘

'' تیرا ہسبینڈ (HUSBAND) بشرطیکہ وہ گڈ لکنگ اور اسمارٹ ہو۔۔ بول کرلے گی شیئر (Share)؟۔'' یہ کہہ کر زاہدہ نے ایک قہقہہ لگایا۔اور کمرے میں چاندی کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

جواب میں۔۔ میں ہنسی اور میں نے اس کی ہتھیلی پر اپنی ہتھیلی جمادی۔ دوسرے دن میں نے اس کے کمرے میں جھانکا۔ زاہدہ ابھی بستر پر ہی تھی بلکہ ایسا لگتا تھا کہ بستر نے اس کو پکڑ رکھا تھا۔۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے کہا۔

'' آج کا خواب سنے گی۔؟''

جواب دیئے بغیر اس کے کمرے میں داخل ہو کر میں نے کرسی گھسیٹی اور اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ جب کہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ بستر پر اس کے برابر جا بیٹھوں اور اس کے چھوٹے چھوٹے نازک ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولوں۔

'' آج کا خواب ہی نہیں تم زندگی بھر کے سارے خواب سنا دو۔

میرے کان تمہارے سُر سنگیت میں ڈھلی ہوئی آواز میں کچھ بھی سننے کے لئے تیار ہیں۔لیکن میں نے صرف اتنا ہی کہا۔۔'' سناؤ۔!''

'' آج میں نے اس کو پہلے ہی پکڑ لیا۔اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر جھپٹتا میں خود ہی اس پر جھپٹ پڑی۔''

''وہی سانپ۔؟''

''وہی ہوگا کل رات والا۔''

''اس کو پکڑ لیا۔۔ پھر کیا کیا۔؟

''وہی کیا جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔ پہلے اپنی سینڈل سے اس کا پھن کچلا۔ جب وہ ادھ موا ہو گیا تو اس کو ایک خالی شاپر میں بند کر کے گرہ لگا دی۔''

''پھر۔۔؟''

''پھر تو آ گئی۔۔''اس نے ہنس کر کہا۔

''مذاق نہیں۔۔۔ آگے کا خواب بتا۔۔''

''میں سچ کہہ رہی ہوں تو خواب میں آگئی اور بولی کہ شاپر کو باہر پھینک دو۔''

جس پر میں نے کہا۔''نہیں۔۔اس طرح تو ہم باہر کسی کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں۔ میں نے سوچا ہے اس کو جلا ڈالنا چاہئے۔۔۔تو نے بھی اس جلا ڈالنے والی تجویز سے اتفاق کیا۔۔''

''پھر۔۔''

''پھر یہ ہوا کہ خواب ختم ہو گیا اور میری آنکھ کھل گئی۔۔''

میں نے زاہدہ کو بدلا بدلا سا پایا۔اس نے خود ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔۔کسی ریفلیکس کے طور پر میں نے پہلے

کرسی اس کے بیڈ کے قریب کھسکائی اور پھر مجھے پتہ بھی نہیں چلا کب میں اس کے بیڈ پر اس کے پہلو میں پہنچ گئی۔اور کب میں نے اپنا دایاں بازو اس کی کمر کے گرد لپیٹا اور کب وہ اپنے بدن کی ساری رعنائیوں کے ساتھ میری گود میں آ گری۔اور جب میں نے اس کے گالوں کو اپنے ہونٹوں سے چھوا تو اس کے ہونٹ آپ ہی آپ میرے ہونٹوں سے پیوست ہو گئے۔

اس تمام دن میں زاہدہ کی خود سپردگی کے کیف میں غرق رہی۔اس کے بعد صبح سویرے جب بھی میں نے اس کے کمرے کا رخ کیا۔۔۔ اس کا کوئی نیا خواب سننے کے خیال سے۔تو اس کا کمرہ اندر سے بند ملا۔میری زندگی میں روزمرہ کے بورنگ تواتر کے سوا کچھ نہ رہا۔زاہدہ کی ان چند لمحوں کی سپردگی نے شاید ایسی گلی میں پہنچا دیا تھا جو کچھ دور چل کر بند ہو گئی تھی۔

ایک رات جب کسی کتاب کے اوراق الٹتے ہوئے میں یہ سوچ رہی تھی کہ مجھے آج جلدی سو جانا چاہئے میرے ذہن میں اس خیال نے سر اٹھایا کہ اس کمرے میں کچھ تبدیلی لائی جائے۔کتاب کو اپنی جگہ رکھ کر میں نے سب سے پہلے اس بند کھڑکی کا رخ کیا جس کو کچھ دنوں سے کھولنا چاہتی تھی۔اس بند کھڑکی میں مصنوعی پھولوں سے بھری ایک ٹوکری رکھی تھی میں نے اس ٹوکری کو اٹھا کر کتابوں کی شیلف کی چھت پر جما دیا اور کھڑکی کو آہستہ آہستہ کھولنے لگی۔ابھی کھڑکی تھوڑی سی کھلی تھی کہ مجھے ایک سایہ سا زاہدہ کے کمرے تک جاتا ہنوز نظر آیا۔اس سائے میں گھر کے کسی بھی فرد کی شباہت نہیں تھی۔سایہ قطعی طور پر اجنبی تھا۔گھر میں اُن دنوں صرف ایک ہی فرد کا اضافہ ہوا تھا۔وہ مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا ہمارا دور کا کزن تھا، جو لندن سے پاکستان آیا تھا۔لیکن میں وثوق سے کے ساتھ اس سائے کو شناخت کرنے کی حالت میں نہیں تھی۔ سایہ زاہدہ کے کمرے تک پہنچ کر غائب ہو گیا۔اوپر کی راہداری اور زینے پر مکمل سناٹا تھا۔زاہدہ کے کمرے کے دروازے کے کھلنے کی آواز (اگر وہ پہلے سے کھلا نہیں تھا) میں نے نہیں سنی تھی۔البتہ اندر سے چٹخنی لگانے کی آواز میں نے صاف طور پر سنی۔ایک اور بات میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی تھی وہ سایہ سانپ نہیں ہو سکتا تھا۔

...... برزخی ......

نومبر کی ایک خنک اور خاصی روشن رات میں نہ جانے کیوں اور کیسے سندھ کے میروں کے شہر خیر پور میرس پہنچ گیا۔ یہ شہر تالپور خانوادے کے میروں کی ریاست کا پایۂ تخت رہا اور ریاست کے خاتمے کے بعد کمشنری آ گئی لیکن یہ شہر چھوٹا ہی رہا۔ چھوٹے شہروں کی مانند جلد سو جانے والا شہر۔ اس شہر میں میں نے اپنی زندگی کے قریباً دس برس گزارے تھے۔ آدھی رات کا سمے تھا۔ خیال سا ہے کہ میں ٹانگے سے پنج گولہ چوک میں اترا۔ چوک کی جامع مسجد سو رہی تھی۔ اس سے لگا ہوا سنیما بھی رات کے آخری شو کے بعد انگڑائیاں لے رہا تھا۔ سینما کے ساتھ جڑا ہوا ہوٹل خرّاٹے لے رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی پرائمری اسکول کے بڑے آہنی پھاٹک پر بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔ پھاٹک کے قریب دیوار سے لپٹا ہوا ایک لڑکا سو رہا تھا۔ وہ ایک پھٹی پرانی چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کے پاس ایک کتا نیم بیدار ایک ایسے آسن میں لیٹا تھا جو لیٹنے اور بیٹھنے کی درمیانی حالت ہو سکتی تھی۔ ٹانگہ اسٹینڈ میں جو چوک سے تھوڑے فاصلے پر تھا دو گھوڑے بیٹھے اور ایک کھڑا تھا۔ دو ٹانگے گھوڑوں کے بغیر اگلا حصّہ اوپر اٹھائے اور پچھلا زمین پر ٹکائے کھڑے تھے۔ گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں طویل طویل وقفوں سے بلند ہو رہی تھیں ۔ میں چوک کے بیچوں بیچ پانچ روشن قمقموں کی تیز روشنی کے نیچے کھڑا تھا مگر آسمان پر روشن چاند سے بھی یکسر غافل نہ تھا۔ میں اپنے اکناف کی ایک ایک چیز سے واقف ہوتا جاتا تھا۔ میں یہ تک جانتا تھا کہ اس ماحول میں کتنی بلّیاں کس کس حالت یا مصروفیت میں ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ کسی گلی سے دو عورتیں آ کر کھڑی تھیں۔ ان کے ساتھ جو ملازم نما آدمی آیا تھا شاید ٹیکسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑ رہا تھا۔ قرینِ قیاس یہی تھا کہ دونوں عورتیں کسی کی اوطاق میں اجتماعی دل بہلاوے کا فرض بھگتا کر اب قریب کے بڑے شہر سکھر کے بازارِ حسن لوٹائی جانے کی منتظر تھیں۔ سچ پوچھئے تو میں خود بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ میں چوک کے بیچوں بیچ کھڑا کیا کر رہا تھا۔ اچانک میری نظر اس پر پڑی وہ تیزی سے اس گلی میں داخل ہو رہا تھا جہاں اس کا کلینک تھا۔ جیسے ہی میں نے اسے دیکھا میری ٹانگیں آپ ہی آپ متحرک ہو گئیں اور دوسرے ہی لمحے میرا پورا وجود اس کے پیچھے تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ (وہ قد میں مجھ سے ٹھگنا تھا) اور حیران ہو کر رہ گیا میں نے محسوس کیا کہ اتنی رات گئے، اپنائیت کے اس مظاہرے پر وہ نہ تو چونکا اور نہ ہی میری جانب پلٹا۔ آخر مجھ کو ہی اس کے سامنے آنا پڑا میں اس کی راہ میں حائل ہوا اور بے تکلفی، خوشی اور محبت کے ملے جلے لہجے میں اسے آواز دی۔

''کس چکر میں ہو ڈاکٹر — اتنی رات گئے وہ بھی اکیلے —؟'' ڈاکٹر نے مجھ سے آنکھیں نہیں ملائیں۔ سر جھکائے کھڑا رہا۔ وہ خاموش نہ تھا منھ ہی میں بڑبڑا رہا تھا۔

''میں بھاگا دوڑی کرتے کرتے تنگ آ گیا ہوں۔ تھک کر چور ہو رہا ہوں لیکن نتیجہ کچھ نہیں!'' اس کی بڑبڑاتی آواز کو سمجھنے میں بڑی دقّت پیش آ رہی تھی لیکن مجھے اس سے بات کرنی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ رات کا باقی حصّہ اس کے ساتھ گزاروں گا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے

اپنے گھر چلنے کے لئے کہے(اس شہر میں کوئی ایسا ہوٹل کبھی قائم نہ ہوسکا جس میں مجھ سا سفید پوش قیام کر سکے)۔ میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی ۔ یہ پوچھنا تو میرا اخلاقی فرض بن گیا تھا کہ اس سے اس کی بھاگ دوڑ کا سبب معلوم کروں لیکن میرے سوال کرنے پر کہ اسے کیا پریشانی لاحق ہے اور وہ کیوں بھاگا دوڑی میں لگا ہے بڑبڑانے کے انداز میں اس نے اپنے پورے فقرے کو ایک بار پھر دہرایا لیکن اس اضافے کے ساتھ ۔

''میرے گھر میں بجلی نہیں ہے— پانی نہیں ہے— دفتر دفتر دوڑتا ہوں شہر کے کونے کونے میں اعلان کرتا پھرتا ہوں ۔لیکن نتیجہ کچھ نہیں !'' چونکہ اس نے اپنے گھر کی بات کی تھی ۔ میں نے موقع غنیمت جان کر اس کو اپنا گھر دکھانے کی بات کر ڈالی ۔

''میں دیکھتا ہوں ڈاکٹر تمہارے گھر میں پانی ،بجلی کیوں نہیں ہے— چلو تمہارے گھر چلتے ہیں۔'' یہ کہہ کر میں اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔وہ میرے آگے آگے تیز تیز چلنے لگا۔لیکن اس نے مجھ سے اب تک آنکھیں نہیں ملائی تھیں ۔اس دوران میں نے اس کو اس کے پورے نام سے بھی مخاطب کیا تھا۔ وہ مجھ سے آگے آگے تیز تیز چل رہا تھا۔ دو تین پیچ دار گلیوں کو پار کر کے وہ اپنے کلینک کے سامنے پہنچ گیا— کلینک کے عین سامنے پہنچ کر وہ رک گیا۔اس نے پہلی بار اپنی جھکی ہوئی نظریں تھوڑی سی اوپر اٹھائیں اور اوپر لگے ہوئے بورڈ کو دیکھا۔لکھا ہوا تھا ''ہیلدی لائف کلینک'' پھر اس نے ایک نظر اپنی نام کی تختی پر ڈالی ۔

خیر پور میرس سے جو خبریں ملتی رہی تھیں ان کے مطابق اس کی بیوی نے کسی نا تجربے کار ڈاکٹر کو واجبی تنخواہ پر ملازم رکھ لیا تھا۔کام تو پرانا کمپاؤنڈر ہی نمٹا رہا تھا۔کلینک کے سامنے تھوڑی دیر رک کر ڈاکٹر آگے بڑھ گیا لیکن اس نے وہ گلی نہیں لی جو اس کے گھر کی طرف جاتی تھی (میں اسکے گھر سے واقف تھا)اس نے بڑبڑانا بند نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے گھر سے مختلف راستوں پر چلتا ہوا ایک مکان کے سامنے رک گیا ۔مکان بند تھا۔ دروازے پر تالا پڑا تھا اور ''برائے فروخت'' کا بورڈ آویزاں تھا۔ڈاکٹر میری طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا لیکن اس کی ٹھوڑی جھکی ہوئی تھی ۔کھڑے رہنے کا انداز ایسا تھا کہ جیسے مجھے رخصت کر رہا ہو۔میں اس کی اس رکھائی اور ڈھٹائی سے گنگ ہو کر رہ گیا۔میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کس قسم کے ردِّ عمل کا اظہار کروں— ؟ میں اس کے سامنے ڈٹ گیا۔

''ڈاکٹر— میں اس طرح نہیں ٹلنے کا— آپ اچھی طرح جانتے ہیں میں سات سمندر پار سے یہاں محض آپ کا دیدار کرنے نہیں آیا — آپ خود سمجھ گئے ہونگے کہ میں ہم تینوں کے مشترکہ دوست ارباب بن عبدالباقی کی موت کے بارے میں سچائی جاننا چاہتا ہوں'' اس کی ٹھوڑی جھکی رہی لیکن اس کے جسم پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔

'' آپ نے ارباب کی موت کو 'ہائی بلڈ پریشر اور کارڈیو ویسکولر فیلیئر' قرار دیا۔اور اس کی لاش خود ہی اس کے بھائی کے پاس حیدر آباد (سندھ) پہنچا آئے— بولتے بولتے رک کر میں نے اس کو دیکھا اس توقع سے کہ وہ کچھ جواب دے—

اس نے کچھ جواب نہیں دیا۔

'' اس کے بھائی نے ہمارے حیدر آباد کے دوستوں کو رو رو کر یہ حقیقت بتائی کہ ارباب کے بدن سے دو گولیاں برآمد ہوئیں— ''

آپ نے ایسا کیوں کیا—؟ اپنے عظیم پیشے کے بنیادی اصولوں سے انحراف کیا۔ آپ نے دوستی کے رشتے کا بھی لحاظ نہیں کیا محض اس سبب سے کہ قاتل آپ کے فرقے سے تعلق رکھتا تھا اور آپ کا یعنی ہمارا عزیز دوست ارباب بن عبدالباقی کسی اقلیتی فرقے سے تھا۔" میری اس قدر لمبی لتاڑ سے وہ متاثر ہوا تھا۔ اس کا بدن شدّت سے کانپا— میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے ایک کچوکا اور دیا— "تم کتنے چالاک نکلے ڈاکٹر— کتنی صفائی سے تم نے اپنے آدمی کو سزا سے بچالیا— قاتل کو بھی بچالیا اور خود بھی بچ گئے—" میں آپ سے تم پر آ گیا تھا— کچھ دیر بعد میں نے ڈاکٹر پر حقارت کی نظر ڈالی اور بولا۔

"تم وہی ہونا— ڈاکٹر— جس کو ارباب بیحد عزیز رکھتا تھا۔ یوں بھی تم ہر کسی کے چہیتے تھے۔ تمہاری مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ شہر کے ہر فلاحی ادارے نے تم کو اپنا مربّی اور سرپرست بنا رکھا تھا— تم کو ہر تعصب سے، ہر تنگ نظری سے بالاتر مانا جاتا تھا۔ تم کو یاد ہے۔ ہر رات کلینک بند کرنے سے پہلے تم میز کی دراز سے چھوٹا سا خرگوش باہر نکال لیتے تھے۔ اس میں لگے ہوئے ایک نپل کو دبا کر اس میں ہوا بھرتے۔ وہ میز کی سطح پر چلتا۔ پھر تم اسے اسی دراز میں رکھ دیتے۔ یہ کلینک بند کرنے کا تمہارا ٹوٹکا تھا۔ اس خرگوش کا اصل مقصد تو کسی روتے ہوئے مریض بچے کو بہلانا تھا۔ لیکن یہ جو تم اس کے ساتھ خود کھیلتے اور میں تمہاری چمکتی آنکھوں اور دمکتے چہرے کو دیکھتا تو سوچتا۔ "دنیا جہاں میں شاید ہی کوئی دوسرا آدمی اتنا معصوم دل ہوگا—" تمہیں اس حالت میں دیکھنے کے لئے اکثر میں تمہارے کلینک کو اپنے سامنے بند کرواتا— کہاں گیا وہ خرگوش— تم نے اسے بھی مار ڈالا ہوگا—؟

اب کی مرتبہ میں نے پہلے سے بھی لمبی تقریر کی۔ ادھر میری بات ختم ہوئی اُدھر ڈاکٹر نے دونوں بازو اوپر اٹھائے، ٹھوڑی اوپر کر کے شاید آسمان کی طرف دیکھا— پھر بازو نیچے کئے— دونوں ہاتھ جوڑ لئے۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرے آگے بھی ہاتھ جوڑ رہا ہو۔ جیسے وہ شدید عذاب سے گزر رہا ہو اور پھر اچانک میرے دیکھتے ہی دیکھتے تالا لگے ہوئے دروازے سے اس خالی مکان میں داخل ہو گیا۔ جس پر "برائے فروخت" کی تختی لگی ہوئی تھی۔

میں کیا کرتا— لوٹ جانے کے سوا لیکن واپسی کے دوران میں نے محسوس کیا کہ میرے کوٹ کی جیب میں کچھ ہے۔ جو پہلے نہیں تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولا— جیب میں "کھلونا خرگوش" آموجود ہوا تھا۔ جس سے ڈاکٹر کلینک بند کرنے سے پہلے کھیلا کرتا تھا۔

پنج گولا چوک پر مجھے ایک ٹانگہ مل گیا اور میں ایک بار پھر اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا ویٹنگ روم میں رات گزارنے لیکن سارا راستہ مجھے یہی لگا جیسے لمبے قد، بھاری بدن، چگی ڈاڑھی اور چھوٹی آنکھوں والا ارباب بن عبدالباقی میرے برابر بیٹھا ہوا مسکرا رہا ہو اور "جوائے رائڈ" ثقفق (Joy ride) کے مزے لے رہا ہو۔ اس کی یہ خصوصیت تھی کہ دن میں تپتی دھوپ میں بھی پیدل چلتا اور ساتھ میں کسی کو گھسیٹے پھرتا اور رات میں ٹانگے میں لدے بنا کہیں نہ جاتا اور ٹانگہ رائڈ— جوائے رائڈ— کی رٹ لگائے رکھتا میں نے اس سے ڈاکٹر سے ملاقات کا ذکر کیا لیکن اسنے صرف اتنا ردِّعمل ظاہر کیا کہ کچھ دیر کے لئے مسکرانا بند کر کے خاموش بیٹھ گیا— بالکل خاموش—

☆☆☆

......گاربیج......

مسی ساگا، انٹاریو، کنیڈا کی یادگار گلی (Memory lane) میں کچرا (Garbage) ہر بدھ اور جمعرات کو رکھا جاتا تھا۔ عورتیں یہ فرض منصبی انجام دیتی تھیں۔ کچرے کی چار اقسام مانی جاتی تھیں۔ پہلا گیلا آرگینک (Organic) کچرہ، جس کو ہرے رنگ کے ڈبے میں رکھا جاتا تا دوسرا کاغذی! (Paper recycle) کچرا جس کے لئے گرے رنگ کا ڈبہ مخصوص ہوتا۔ تیسرا وہ کچرا جو شیشے اور پلاسٹک کی خالی شیشوں، بوتلوں، برتنوں اور ٹین کے خالی ڈبوں پر مشتمل ہوتا اور نیلے ڈبے میں رکھا جاتا۔ چوتھا وہ عام کچرا، کوڑا کرکٹ جو کسی بڑے شاپر یا تھیلے میں ہوتا۔ بدھ کے دن شام 7 بجے کے بعد اور جمعرات صبح 7 سے قبل ہر مکان کے پیش لان کے سامنے، سائڈ واک سے ملحق کچرے کے ڈبے اور تھیلے رکھ دئے جاتے۔ کچرا لیجانے والا ٹرک جب جب مجھے دکھائی دیا۔ (اگر چہ ایسا شاذ شاذ ہوتا) میرے کمرے کی کھڑکی سے وہ منظر عجب سا لگا۔ میرا کمرہ گیریج کے اوپر تھا۔ ٹرک میں بیٹھا ہوا ڈرائیور مجھے کبھی نظر نہیں پڑا۔ میں کھڑکی کے قریب کھڑا، باہر دیکھتا ہوتا۔ ٹرک رکتا۔ اس کے اندر سے ایک خاص لباس پہنی ہوئی مخلوق برآمد ہوتی، ایک ہی جست میں کچرے کے ڈبوں اور تھیلے پر جھکتی اور دوسرے ہی لمحے ٹرک کے اندر غائب ہو جاتی، ٹرک چل پڑتا۔

پتہ نہیں کیوں میری نظروں نے 'کچرہ ٹرک' کو کبھی کچرہ ٹرک نہیں مانا۔ مجھے ہمیشہ ہی یوں لگا جیسے وہ آسمان سے نازل ہونے والی گاڑی ہو—— مقدس اور لائق تعظیم اور اس میں سے برآمد ہونے اور دوبارہ اندر ہو جانے والی مخلوق بھی مجھے غیر انسانی لگی۔ میری سوچ تصویروں والی ہے۔ میں جو کچھ سوچتا ہوں وہ مووی کیمرے کی تصاویر کی مانند میرے پیشِ نظر آتا جاتا ہے۔ جب بھی اتفاقیہ طور پر مجھے وہ کچرا ٹرک نظر آتا ہے تو میرے ذہن کے مووی کیمرے کی رِیل گردش میں آجاتی ہے۔ یوں لگتا ہے میدان حشر میں ہوں (ادائیگی حج کے دوران میدان عرفہ کو لوگوں نے میدان حشر سے تشبیہ دی تھی)—— آسمانی مخلوق نے زمینی مخلوق کے ہاتھوں میں ان کے اعمال نامے تھما دئے ہیں اور سب کو گروہوں میں بانٹ دیا گیا ہے——وہ—— جن کو زندگی ہی میں جنت کا حقدار بنا دیا گیا تھا یا وہ جنہوں نے اپنے کرم بھوگ لئے تھے—— جنت کی طرف چلتے کر دیے گئے ہیں۔ باقی لوگوں میں ایک گروہ کے لوگوں کے دائیں ہاتھوں میں اور دوسرے گروہ کے لوگوں کے بائیں ہاتھوں میں اعمال نامے پکڑا دیئے گئے ہیں۔ ان گروہوں کی تقسیم در تقسیم بھی کر دی گئی ہے۔ ہر گروہ اپنے پیشوا کے ساتھ ہے۔ آسمانی مخلوق اپنے مخصوص یونیفارموں میں ملبوس (کچرے گاڑی کی مخلوق کی مانند) میدان حشر کا انتظام سنبھالے ہوئے ہے۔ قطار در قطار لوگ، فرداً فرداً کرسئ عدالت کے سامنے پیش ہو رہے ہیں۔ ہر کسی کا مقدمہ سنا جا رہا ہے۔ شاید اسی کو یوم الدین، انصاف کا دن بھی کہا جاتا ہے۔ اسی دن کے بارے میں مذاق کرنے والے کہتے تھے ''قیامت کس نے دیکھی ہے۔؟'' قیامت برپا تھی۔ قیامت برپا ہے، سو ہے جو آنکھ والے ہیں، انہیں دکھائی بھی دے رہی ہے۔ کرسئ عدالت کے عقب میں مناسب فاصلے پر بے شمار ٹرک نما گاڑیاں کھڑی ہیں۔ ان کی رنگت سیاہ ہے۔

ان گاڑیوں میں داخل اوران سے برآمد ہونے والی اوراپنے فرائض کی ادائیگی میں،مصروف مخلوق کے یونیفارم کا رنگ سفید وسیاہ ہے میری سوچوں نے مجھے عرصۂ محشر میں پہنچایا تھالیکن آنکھوں نے وہاں سے کمرے میں لا ڈالا شایداس سبب سے کہ میں نے دیکھا سامنے گھر سے ایک خاتون کچرارکھ رہی تھیں۔ یہ معمول کے خلاف ہورہا تھا۔اس پوری گلی میں صرف سامنے والا گھر ہی ایسا تھا جس کا کچرا ایک بڑی عمر کا مرد رکھا کرتا تھا۔ عام طور پر ہر صبح، گرمی، سردی، برسات اور برف باری کے فورا بعد بھی میں ان بزرگ کو ہی فعال دیکھا کرتا۔سرد رُت میں برف کوشاول (ہٹاتے ہوئے) کرتے ہوئے۔ بہاررُت میں پودوں کی کٹائی چھٹائی کرتے ہوئے چیزوں کوسلیقے سے ادھرادھر رکھتے ہوئے گاڑیوں کو دھوتے ہوئے۔ کچرار کھنے والی خاتون نے جو ہندستانی تھیں ایسا اسکرٹ پہنا ہوا تھا جو مقامی کینیڈین خواتین پہنا کرتی ہیں فرق صرف یہ تھا کہ اسکرٹ کا رنگ میکسیکن خواتین کے لباس کی طرح شوخ اور گہرا تھا اس پر رنگ برنگی چوڑی اسٹرائپس (پٹیاں بھی تھیں۔اس خاتون کی پنڈلیاں برہنہ تھیں اگر چہ موسم بڑی حد تک سرد تھا البتہ پیروں میں برف جوتے اور سر پر اونی ٹوپی اوراسکارف تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھرادھر نظر ڈالی۔ وہ اپنے کام کو پھرتی سے نمٹا رہی تھیں لیکن اس کے بدن، کمر اور کولہوں کی حرکات میں کچھ ایسی بات دکھائی دی کہ میری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔اسکا چہرہ اس کے لباس کے شوخ رنگ سے لگّا نہیں کھاتا تھا۔ چہرے کی زبان پر تھا کہ کچھ ہوگیا ہے یا ہو رہا ہے اوراس کی نوعیت المناک ہے۔ کچرے کے ڈبے اورتھیلا صحیح جگہ رکھ کر وہ خاتون گھر کے اندر چلی گئی۔ گیریج کا شٹر نیچے آگیا لیکن میں اس چہرے پر اپنی نظریں جمائے دیر تک کھڑا رہا۔ میں بچپن ہی سے ایسا ہوں۔ اکثر اوقات غیر موجود کوموجود پاتا ہوں۔خود اپنے بارے میں میری محسوسات کچھ ایسی ہی ہیں۔ایک لحظ کہیں، دوسرے لحظے کہیں ہوتا ہوں۔ میرے اعضاء معمول کے کام نمٹانے میں مصروف رہتے ہیں۔ان کاموں سے میری سوچوں کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ میرے اعضاء کی اکثر حرکات غیرارادی، ریفلکس ایکشن کے طور پر سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ذہن ان حرکات سے بے نیاز اپنی سوچوں میں مصروف رہتا ہے۔

معمول کے کاموں سے فارغ ہوکر میں اپنے کمرے سے باہر نکلا اور بالائی راہداری سے ہوتا ہوا، پیچیدہ چوبی زینے کی سیڑھیاں طے کر کے نیچے پہنچ گیا جہاں ناشتے کی تیاریاں آخری مراحل پر تھیں۔

''سامنے والے مکان میں کیا ہوا۔؟'' اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھتے ہوئے میں نے بیوی اور بہو کی جانب ایک سوال اچھال دیا۔ بیٹا اس وقت تک ناشتے کی میز پر نہیں آیا تھا۔دونوں چونک سی پڑیں۔ چہرے گھمائے بنا میری جانب نظریں ڈالیں۔

''سلام علیکم پاپا'' بہو نے مجھے صبح کا سلام کیا۔ بہو مجھے پاپا کہتی ہے۔میرا بیٹا یعنی اس کا میاں بھی مجھے پاپا پکارتا ہے۔

''آپ کوکس نے بتایا۔؟'' میری بیوی نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

''مجھے کوئی بتانے والا ہے سوائے آپ کے۔ میں تو یونہی پوچھ رہا تھا۔''

''آپ کوتو کوئی پرائیویٹ آئی (جاسوس) ہونا تھا۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ضرور کوئی بات ہے۔''

''افسوسناک چیز ہے۔سن کر آپ کو بھی دکھ ہوگا۔ نیچے والی (بیسمنٹ والی) بتا کر گئی ہیں کہ سامنے کے گھر والے بڑے میاں کل دوپہر

سے غائب ہیں۔"

"غائب ہیں۔کیا مطلب۔؟"

"ناشتے کے بعد کہیں نکل گئے تھے۔سارا دن اور ساری رات نہ تو وہ لوٹے اور نہ کہیں سے ان کی کوئی خبر آئی۔نائن ،ون ون ایمرجنسی کو بھی فون کرر کھا ہے۔"

نیچے والی کو کس نے بتایا۔؟"

"سامنے والے گھر کی عورتوں نے۔آپ تو جانتے ہی ہیں۔نیچے والی بھی سامنے والے گھر کے لوگوں کی مانند چنائی (انڈیا) کی ہیں۔ نیچے والی نے آپ کی طرح کچھ محسوس کیا ہوگا اور دریافت کیا ہوگا۔"

"یہ جو آپ نے فرمایا۔نیچے والی نے آپ کی طرح کچھ محسوس کیا ہوگا۔اس سے آپ کا کیا مطلب ہوا۔؟"

"آپ محسوس کر لیتے ہیں نا۔کیا یہ سچ نہیں ہے۔؟"

"آپ کی تو ہر بات سچ ہی ہوتی ہے لیکن ایک بات بتائیے یہ آپ نے میرے محسوس کرنے کو کب سے محسوس کرنا شروع کر دیا ہے۔؟"

"اسی وقت سے شروع کر دیا ہے۔چلئے یہی سمجھ لیجئے لیکن ناشتہ تو شروع کر دیجئے مجھے بھوک لگ رہی ہے۔بیگم کی اس بات پر میں نے چونک کر دیکھا۔میری پلیٹ میں بیگم نے گرم گرم پراٹھا ڈال دیا تھا۔بیگم اور بہو معمول کے اخلاق کے مطابق منتظر تھیں کہ میں پہلا نوالہ لوں تو وہ اپنے اپنے ناشتے پر ٹوٹ پڑیں۔میں نے اپنی چھوٹی پلیٹ میں آلو کی دو چار قتلیاں ڈالیں اور پراٹھے کا ایک ٹکڑا توڑ کر آلو کی قتلی کے ساتھ نوالہ بنا کر منہ میں رکھا،اسے ذرا سا چبا کر چائے کا ایک بڑا گھونٹ لیا۔میرے فوراً بعد بیگم اور بہو نے ہاتھ اور منہ کی لڑائی کا آغاز کر دیا اور ساتھ ہی آپس میں بولنے بھی لگیں۔جب بیگم اور بہو باتیں کرتیں تو میں خاموش رہتا کیونکہ اسی میں سب کی عافیت ہوتی۔اس دوران میں ایک بار پھر میدان حشر میں پہنچ گیا۔اب کی مرتبہ میں نے سامنے والے بڑے میاں کو وہاں یکھا۔وہ اپنی عادت کے مطابق ایک ایک قدم ناپ ناپ کرر کھ رہے تھے لیکن ان کے چہرہ کوئلہ آگ ہو رہا تھا۔ان کے ہاتھ میں ان کا اعمال نامہ تھا میں نے ان کے ہاتھ پر نظر ڈالی یہ دیکھنے کے لئے کہ ان کا اعمال نامے والا ہاتھ سیدھا تھا کہ الٹا لیکن سیدھے الٹے میں تمیز نہ کر سکا۔یہ میری فطری کمزوری ہے۔بچپن میں ہمیشہ الٹے پیر کا جوتا سیدھے پیر میں ڈالنے کی کوشش کرتا۔اس سے پہلے کہ میں ان کے سیدھے اور الٹے ہاتھ کے بارے میں کسی فیصلے پر پہنچتا وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔نامہ اعمال کے بارے میں میری محسوسات واضح ہو گئی ہیں کیونکہ میں مستقبل میں دور، بہت دور نکل آیا ہوں اور عرصہ محشر میں ہوں ہر نامہ اعمال آسمانی کمپیوٹر سے نکالا گیا پرنٹ آؤٹ ہے۔آسمانی کمپیوٹر کبھی خراب نہیں ہوتے۔ان پر کسی وائرس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ان کے اندراجات ٹھیک ٹھیک ہوتے ہیں۔جس نے رمق برابر بھی بھلا کیا درج شدہ موجود ہے۔جس نے رمق برابر بھی برا کیا ہے بغیر کسی کمی بیشی کے درج ہے۔اصل امتحان اور معاملہ کرموں سے تعلق رکھتا ہے۔اعمال ناموں میں آدمی کے کرم بھی درج ہوئے جا رہے ہیں اور جس نے جس طرح مکافات عمل سے دوچار ہو کر اپنے کرم بھوگ لئے ،اپنا حساب چکتا کر لیا وہ سب بھی۔آسمانی کمپیوٹرر کے بغیر کام میں مصروف ہیں اس سے تک جب شاید سب کچھ ہی رک جائے۔سے بھی۔فی الحال میرے اپنے گھر میں ماحول بدلتا

دیکھتا ہوں اور ناشتے کی میز سے اٹھ کر ایک مرتبہ پھر اوپر چلا آیا ہوں۔ کھڑکی سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر بلائینڈس نیم وا کر کے باہر جھانک رہا ہوں مشرق ہوتا تو اس سامنے والے گھر کے آگے مجمع لگ جاتا لیکن یہ مغرب ہے، مجمع تو نہیں لگا البتہ گھر کے آگے ایک دو گاڑیوں کا اضافہ ضرور ہو گیا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے دو پولس گاڑیاں سامنے آ کر رک گئیں۔ ایک سے دو افسر اترے اور سامنے والے گھر کے دروازے کی طرف بڑھے۔ دوسری کار سے اترنے والے افسر آس پاس گھروں کی گھنٹیاں بجانے لگے۔ میں کھڑکی سے ہٹ گیا اور کچھ توقف کر کے نیچے چلا گیا۔ نیچے فیملی روم میں میرا بیٹا گھر کے لوگوں کو بتا رہا تھا کہ پولس افسر نے اس سے دروازے پر کھڑے کھڑے ایک دو سوال کئے البتہ نیچے والی سے اندر جا کر بات کی۔ اس گلی میں صرف نیچے والی ہی سامنے والوں کی زبان بولتی تھی اور اس طرح اس کا رشتہ آپ ہی آپ سامنے والوں سے جڑ جاتا تھا۔ زبان کے اشتراک کے علاوہ ان میں کسی قسم کا اشتراک نہیں تھا۔

میرے بیٹے نے سب کو تاکید کر دی تھی کہ سامنے والے گھر سے کوئی واسطہ نہ رکھا جائے۔

''لیکن نیچے والی۔؟۔؟'' میری بیگم نے بیٹے کو توجہ دلائی۔

''وہ جانیں اور ان کے کام'' بیٹے نے فیصلہ سنایا۔ اس فیصلے کے اعلان کے بعد کچھ دیر کامل سکوت رہا پھر قیاسات کا سلسلہ شروع ہوا۔ بڑے میاں کے بارے میں بیٹے کا قیاس تھا کہ گھر والوں کی چوری سے اپنے آبائی وطن چنائی، انڈیا چلے گئے۔ اس قیاس کے خلاف سب سے پہلے اس کی بیوی نے تقریر جھاڑی۔ بیگم دونوں کے درمیان والی راہ سوچنے میں الجھ گئیں۔ کبھی کچھ، کبھی کچھ ایک دوسرے سے متضاد بیانات دیتی رہیں۔ میں نے نہ تو کچھ سوچا اور نہ ہی ان تینوں کی باتوں میں دخل دیا۔ چپکے سے اٹھا اور زینے کی جانب چل پڑا۔ بیگم نے جب مجھے وہاں سے فرار ہوتے دیکھا تو بولیں۔ ''اجی اپنے محسوسات تو بتاتے جاؤ'' پتہ نہیں وہ میری محسوسات کا مذاق اڑا رہی تھیں یا سنجیدگی سے مطالبہ کیا تھا۔

''نو (NO) محسوسات'' میں نے جواب دیا''

''پھر بھی — آپ کے خیال میں بڑے میاں کا کیا بنا ہوگا۔؟''

''گاربیج ہو گئے ہونگے۔ اور کیا ہونا تھا۔'' یہ کہہ کر میں زینہ پر چڑھ گیا۔

''عجیب آدمی ہیں۔ آج گاربیج کا دن ہے نا۔ وہی ان کے سر پر سوار ہے''

زینے پر چڑھتے ہوئے، بیگم کے یہ الفاظ میں نے صاف طور پر سن لئے۔

رات گئے پولس کار آئی۔ کچھ دیر بعد واپس چلی گئی، نیچے والی سے جو خبریں مرحلہ وار ملیں ان کی رو سے بڑے میاں کو کسی نے چھریوں کے وار سے قتل کر دیا تھا۔ لاش ایرپورٹ کے قریب ملی تھی۔ قاتل ان کا بٹوہ لے اڑا تھا۔ قیاس تھا کہ بٹوے میں موٹی رقم تھی جو بڑے میاں نے حال ہی میں دو قسطوں میں بینک سے نکلوائی تھی۔ شوخ رنگ کی پٹیوں والے اسکرٹ والی خاتون جن کو میں ان کی بیٹی یا بہو خیال کرتا تھا حقیقت میں ان کی بیوی نکلیں اور ہاں مقتول گونگے نہیں تھے۔

ان معلومات کے بعد یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ میری سوچوں نے حشر کے میدان میں ان کو دکھایا تھا تو کیا وہ حقیقت میں وہاں موجود تھے اور کیا میں نے وہاں جو کچھ دیکھا تھا وہ سب حقیقت تھا۔؟

☆☆☆

......پرورش......

میں جب اپنے لڑکے کو عام عراقی بچوں سے مختلف پاتی ہوں تو اپنے ذہنی ردِّعمل کو خود بھی نہیں سمجھ پاتی۔ مجھے یہ بھی نہیں پتہ کہ میں دل ہی دل میں رو رہی ہوں یا ہنس رہی ہوں۔ اس کیفیت سے خود کو آزاد کرنے کے لئے میں کھانسنے لگتی ہوں۔ موقع بے موقع اور وقت بے وقت۔ کھانسی کوئی مستحسن فعل نہیں یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں پڑھی لکھی عورت ہوں۔ مقامی اسکولوں کے علاوہ، لندن میں بھی کچھ دن پڑھ چکی ہوں۔ لندن میں ایک گورا لڑکا فلپّ وان جو قد میں میرے برابر لیکن بے حد موٹا تھا میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اس کو میرے چہرے پر ناک اور میرے بدن میں پتلی کمر بہت پسند تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ پورے عراق میں شاید ہی کسی لڑکی کی اتنی ستواں ناک کے ساتھ۔ اتنے پتلے نتھنے ہوں۔ اور میری کمر تو آج بھی چیتے کی کمر ہے۔ نہ ہونے کے برابر اور بے حد لچک دار— مجھے یقین سا تھا کہ فلپّ مجھ سے فلرٹ نہیں کرتا تھا سچ مچ مجھ پر مرتا تھا۔ لیکن میں نے اس کو گھاس نہیں ڈالی۔ میں جانتی تھی کہ اگر میں فلپّ سے ملوں گی تو دوسرے لڑکے مجھے نہیں چھوڑیں گے، میں چھوڑنے کے لائق تھی بھی نہیں یہ میں اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ میں اگر فلپّ سے اکیلے میں ملوں گی تو اسکول کے بُلی (BULLY)۔ لڑکے فلپّ کو نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے اپنا امیج (IMAGE) ایک ایسی عرب مسلم لڑکی کا بنایا ہوا تھا جس پر ایک غیر مرئی لیبل چسپاں ہو''فاصلہ رکھو'' (Keep Distance)۔ وہ بھی کیا دن تھے لیکن میں یہ سب کچھ کیوں سوچ رہی ہوں۔ وہ لڑکی جس پر فلپّ مرمٹا تھا کوئی اور تھی۔ یہ لڑکی یا عورت جو میں اب ہوں کوئی اور ہے۔

کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ بظاہر آپ ہی ہوں لیکن کوئی اور آپ کے اندر حلول کر جائے۔ اور آپ کو کوئی اور بنا دے۔ میں نے یا تو غلط الفاظ کا استعمال کر لیا ہے یا میری سوچ غیر واضح ہے۔ میرے اندر کوئی آ گیا یا حلول کر گیا۔ ایسا نہیں ہے۔ نہ ہی میں کسی کے اندر حلول کر گئی ہوں— تو پھر کیا ہوا ہے؟ یہ بھی ممکن ہے مجھے معلوم بھی نہیں ہوا لیکن میں مر بھی گئی۔ اور میرا دوسرا جنم بھی ہو گیا۔ اگر ایسا ممکن ہے تو میرے ساتھ پھر ایسا ہی ہوا ہوگا۔

کیونکہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس رات میں مر گئی تھی—

عجیب رات تھی شہر لٹ پٹ گیا تھا۔ شہر کا نام نہیں بتاؤں گی میں نے اپنا نام بھی کب بتایا ہے۔ نام تو ان کو ساجتے ہیں جن کی کوئی تاریخ ہوتی ہے اور جن کا جغرافیہ اتھل پتھل نہیں ہوتا۔ میرا گھر آسماں سے بمباری اور زمینی گولہ باری سے آدھے سے زیادہ ملبے کا ڈھیر ہو چکا تھا۔ ایک میرا مکان ہی کیا اس گلی بلکہ محلّے کے سب مکان اور ان کے مکینوں پر قیامت ٹوٹ چکی تھی۔ میرے باقی ماندہ گھر کے مکینوں میں سے صرف دو نفوس زندہ بچے تھے ایک میری بوڑھی دادی اور ایک میں۔ میرے ماں باپ اور اکلوتا بھائی مرے پڑے تھے۔ دوسرے دن ان کے کفن دفن کے لئے مجھے بہت کچھ کرنا تھا۔ لیکن تازہ مسئلہ یہ درپیش تھا کہ گھر میں پانی کی ایک بوند بھی نہیں تھی۔ گھر کی ٹوٹ پھوٹ سے پانی کا

نلکا مسدود ہو گیا تھا۔ باورچی خانہ، غسل خانہ وغیرہ زیرِ زمین سما چکے تھے۔ دادی پیاس سے بے تاب تھی اور میں بھی۔ اپنے لئے نہیں تو دادی کے لئے پانی مہیا کرنا ضروری تھا۔ اور وہ بھی جلد۔ باہر تباہی ہی تباہی تھی۔ ہمت کر کے میں نے بغیر سوچے سمجھے ایک جانب چلنا شروع کیا۔ چل کیا رہی تھی ملبے کے ڈھیروں سے ٹھوکریں کھا رہی تھی۔ آس پاس کے پہچان کے لوگوں کے گھر کھنڈر تو تھے ہی لیکن ان کے مکینوں میں سے اکثر مر چکے تھے۔ باقی ماندہ ادھر ادھر نکل چکے تھے۔ مجھے بھی وہاں سے چلا ہی جانا چاہئے تھا لیکن معذور دادی کو لے کر رات میں وہ بھی اندھیری رات میں اس کھنڈر علاقے سے گزرنا آسان نہیں تھا۔ بجلی تو شاید شہر بھر کی بند پڑی تھی۔ دادی کو ان کی معذوری کے ساتھ تنہا چھوڑ کر فرار ہو جانا مجھے منظور نہ تھا۔ ابھی کچھ دور ہی چلی تھی کہ مجھے محسوس ہوا کہ کوئی گاڑی دندناتی، ملبے سے لڑتی ہوئی قریب ہی رکی۔ میں خوف سے لرزتی ہوئی ملبے کے ایک ڈھیر میں گھس پڑی۔ اگر چہ ایسا کرنے سے میری ہتھیلیوں، کہنیوں، گھٹنوں میں خراشیں آ گئیں۔ وہ فوجی گاڑی تھی اس سے صرف ایک فوجی اترا تھا میں یہ سب غور سے دیکھ رہی تھی۔ تاریکی کے باوجود مجھے ہر چیز پر نظر رکھنا ضروری ہو رہا تھا۔ یہ تو صاف ظاہر تھا جو فوجی ٹرک سے اترا تھا وہ عراقی نہیں تھا۔ امریکی، یا اطالوی کوئی بھی ولد الحرام ہو سکتا تھا۔ میں بغیر آواز کے رو رہی تھی ''و لا یـؤدہ حفظهما وهوالعلی العظیم'' قرآن کریم کی اس آیت کریمہ کا ورد میں نہیں بلکہ میرے اندر کا وجود مسلسل کئے جا رہا تھا۔ میرے ہونٹ کانپ رہے تھے لیکن میری زبان گنگ تھی۔ میں دل ہی دل میں پورے خشوع اور خضوع کے ساتھ دعا مانگ رہی تھی کہ وہ جو کوئی بھی ہو مجھے دیکھ نہ پائے۔ لیکن اس خنزیر نے مجھے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ اس کے آہنی بوٹوں کی گڑ گڑاہٹ جو ملبے کے ٹکڑوں کو چورا چورا کر رہے تھے قریب ہوتی چلی گئی۔ میرے قریب آتے ہی اس نے عربی میں تحکمانہ لہجے میں آواز لگائی ''جو کوئی بھی ہو فوراً باہر آ جاؤ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر ورنہ میں فائر کھولتا ہوں۔'' کم بختوں کو ٹوٹی پھوٹی عربی سکھا دی جاتی ہے۔'' میں نے اس سوّر کے تخم کو کوستے ہوئے سوچا۔ اور ہاتھ اوپر اٹھائے باہر آ گئی۔ اس نے سر سے پیر تک دیکھا۔ چھلانگ لگا کر دبوچا اور انتہائی پھرتی سے میرا بدن ٹٹولا۔ ہنسا اور بولا — اس کھنڈر میں کیا تلاش کر رہی ہے — ؟

''پانی!'' میں نے جواب دیا۔

''پانی تو بہت ہے میرے پاس — چل میرے ساتھ'' یہ کہہ کر وہ پھر ہنسا اور مجھے گھسیٹنے لگا۔''

''میری دادی کے لئے پانی'' Drinking water for my granny

اس مرتبہ میں نے انگریزی میں جواب دیا۔

''تو انگریزی جانتی ہے — ؟'' (You know English)

اس بار اس نے انگریزی میں سوال کیا۔

''ہاں — !'' میں بولی — لندن کے میری کلاسیو اسکول میں پڑھ چکی ہوں۔''

یہ سن کر اس کا رویّہ ایک دم تبدیل ہو گیا۔

''کہاں ہے تمہاری دادی اس نے انتہائی ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ میں نے اپنے کھنڈر مکان کی جانب اشارہ کیا جو دکھائی نہیں دے رہا

تھااور بولی۔

''یہاں سے زیادہ دور نہیں'' یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بولا۔

''میں ڈیوٹی پر ہوں اور ہم کو اجازت نہیں کہ مقامی لوگوں سے ملیں جلیں، پھر بھی میں تمہارا ٹھکانہ دیکھ لیتا ہوں شاید کل کچھ کر سکوں۔تم آگے چلو— میں تمہارے کچھ پیچھے آتا ہوں—''

''او کے— بہت بہت شکریہ!'' میں انگریزی عربی ایک ساتھ بولی ''یو آر ویلکم'' اس نے جواب دیا۔

میں نے اس پر ایک بھر پور نظر ڈالی۔ وہ جس کو تھوڑی دیر پہلے میں نے خنزیر کی اولاد کہا تھا۔ اس وقت مجھے فرشتہ نظر آ رہا تھا۔ اور خوبصورت بے حد خوبصورت— میرے ٹوٹے پھوٹے مکان تک پہنچ کر اس نے مجھ پر ایک نظر ڈالی۔ پانی کی بوتل اور بسکٹوں کا ایک پیکٹ اپنے یونیفارم میں کسی جگہ سے برآمد کر کے مجھے پکڑایا۔ ''بائی بائی'' کہتے ہوئے میری پیشانی کو اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے چھوا اور مستعد فاتحانہ انداز میں وہاں سے چلا گیا— میں نے دادی کو فوری طور پر پانی دیا۔ وہ بے چاری یہ سمجھ رہی تھی کہ میں یا تو مر گئی یا اس کو تنہا چھوڑ کر بھاگ گئی۔ ہم دونوں نے بسکٹ کھائے اور پانی پیا۔ ہمارے بالکل پاس ہمارے پیاروں کی لاشیں پڑی تھی۔ ان کے مردہ جسم شاید اکڑ گئے تھے اور ان کی روحیں ہم دونوں دادی پوتی کے آس پاس بھٹک رہی تھیں یا پھر ان فرشتوں کے حصار میں تھیں جو مرنے والوں کی روح سے ابتدائی پوچھ گچھ کرتے ہیں۔

کھنڈر میں رات گذری اور صبح ہوئی۔ یوں لگا جیسے میری زندگی کی پہلی رات اور پہلی صبح تھی۔ جاتے ہوئے وہ اپنا نام بتا گیا تھا۔ میرا پوچھ گیا تھا۔ دوسرے دن آنے کو کہا تھا لیکن نہیں آیا۔ البتہ وہ ہم سے غافل بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کی توجہ ہی تھی جس نے میری دادی اور مجھے ''ریڈ کراس'' والوں کی حفاظت میں پہنچا دیا تھا۔ وہ ہم دادی، پوتی کو اپنی عارضی پناہ گاؤں میں لئے پھرتے رہے دادی کا علاج ہوا اور مرحومین کی تدفین میں بھی کامیابی ہوئی۔ اس تمام دوران وہ نہیں آیا۔ لیکن اس کی پرچھائیں میرے آس پاس لہراتی رہی۔

عجیب آدمی تھا یا فوجی ڈسپلین سے بندھا تھا کہ ایک پرچہ بھی اس کی جانب سے موصول نہیں ہوا۔ البتہ میرے معاملات بہتر ہوتے گئے۔ ریڈ کراس کے اس گروپ نے مجھے اپنے عملے کے ساتھ شامل کر لیا۔ میں زخمیوں کی مرہم پٹی کے کام میں تربیت یافتہ نرسوں کے شانہ بشانہ کام کرنے لگی۔ ہماری حفاظت کا بندوبست بھی تھا ہمارے کاموں میں اڑچن پیدا ہوتی تھی۔ لیکن اس کا باعث باہر والوں سے زیادہ عراقی ہوتے تھے۔ وہ عراقی جو باہر والوں کو اپنے ملک سے باہر نکالنا چاہتے تھے اور ان کے لئے جگہ جگہ دیوار بن رہے تھے۔ ان ریزسٹ (Risist) کرنے والوں میں تھوڑے ہی سے سہی ایسے اہل عرب بھی تھے جو 'ریڈ کراس' والوں کو بھی شبہے کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور مواقع ملتے ہی ریڈ کراس کے چھوٹے بڑے کیمپوں یہاں تک کہ ہسپتالوں کو بھی اپنا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے تھے۔ حفاظت کے ہمہ وقت اور ہمہ جہت انتظامات کے باوجود ریڈ کراس والوں کو طرح طرح کے نقصانات اٹھانے پڑتے تھے۔ زخمیوں کے لئے مرہم پٹی کا سامان ضائع ہو جاتا تھا۔ دوائیں برباد ہو جاتی تھیں۔ چھوٹے بڑے آپریشن کے لئے ضروری آلات ٹوٹ پھوٹ جاتے۔ بستر وغیرہ کی قلت میں اضافہ ہو جاتا۔ غذاؤں کی کمی ہو جاتی۔ جانوں کا بھی زیاں ہو جاتا۔ ڈاکٹر، نرسیں اور میڈی کیٹر کے دیگر افراد بھی کسی حملے کی زد

میں آ کر ختم ہو جاتے اور تو اور شرمناک پہلو یہ بھی تھا کہ ریڈ کراس کی خواتین کی عصمتیں بھی محفوظ نہیں تھیں۔ اس میں باہر والوں اور مقامی لوگوں میں خاص فرق نہ تھا موقع دستیاب ہونے پر دونوں ہی اقسام کے مرد اپنے ہاتھ رنگ لیتے تھے۔ اگر چہ عام عراقی خواتین کے مقابلے میں ریڈ کراس والیاں قدرے محفوظ ضرور تھیں۔ میں اپنے پروردگار کا شکر ادا کر رہی تھی۔ رب العالمین کی رحمت کا سایہ مجھ پر تھا۔ میں عراق کی خواتین کے مقابلے میں ہزار گنا محفوظ تھی اور ایک نہایت ہی افضل کام سے جڑی ہوئی تھی۔ زخمیوں کی مرہم پٹی اور خدمت کا کام — میرا شمار عام عراقی عورتوں میں نہ تھا جو فوجیوں کے لئے وقف ہو چکی تھیں۔ مفتوحہ ملک کی مفتوحہ عورتیں — باہر والوں کے لئے 'مالِ مفت' اور مقامی اہلِ حرب کے لئے 'مالِ غنیمت' ریڈ کراس کیمپ اور عارضی ہسپتال خانہ بدوشی کی حالت میں کام کر رہے تھے۔ ان سے متعلق عورتیں، ٹین ایجز لڑکیاں، ادھیڑ عمر کی خواتین، پیرامیڈس نرسیں، ڈاکٹر اس روز روز کی شفٹنگ اور تبدیلی کی وجہ سے غیر محفوظ مرحلوں سے بھی گذرتیں، میں بھی لاکھ کوششوں کے باوجود غیر محفوظ ہونے سے محفوظ نہ رہ سکی۔ فوجیوں سے روندی گئی جن میں دو عراقی اور ایک باہر والا تھا۔ ایک شام بالآخر اس کا دیدار ہوا۔ اس مرتبہ بھی وہ ملنے نہیں آیا تھا بلکہ اسے لایا گیا تھا۔ ایک زخمی کے طور پر۔ جیسے ہی میں نے اسے دیکھا پہچان گئی۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ بغیر دیکھے میں اس کی طرف کھنچی چلی گئی۔ وہ بے ہوش تھا، زخمیوں سے چور تھا۔ رب کریم کا شکر ہے کہ ہمارا کیمپ ان دنوں خاصے محفوظ علاقے میں تھا اور اس میں ہر سہولت موجود تھی۔ میرے اس تک پہنچنے سے قبل وہ ایک نہایت ہی لائق ڈاکٹر کے معائنے سے گزر چکا تھا۔ اور اسی کی ہدایت کے مطابق ایک نرس نے اس کو انجکشن دے کر درد کی اذیت سے چھٹکارا دلایا تھا۔ جس کے زیرِ اثر وہ نیند کی آغوش میں جا چکا تھا۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا نیند میں عارضی طور پر وہ اپنی جسمانی اذیتوں سے آزاد ہو گیا تھا۔ وہ مجھے بے حد حسین لگ رہا تھا۔ مردانہ حسن کا مکمل نمونہ۔ اگر چہ قبیح اور بدصورت جنگ نے اس کے جسم کو سر سے پیر تک چھید ڈالا تھا۔ اس سے قبل اس رات بھی مجھے وہ بہت حسین لگا تھا جب اس نے پیاسی دادی اور میرے لئے بسکٹ اور پانی کی بوتل دی تھی۔ کھنڈر میں اس سے وہ پہلی ملاقات میری زندگی کی یادگار ملاقات تھی۔ اگر چہ اس رات میں اپنے والدین سے محروم ہو گئی تھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ اس کیمپ میں لائے جانے کے دوسرے دن ہی جب وہ ہوش میں آیا تو اس نے مجھے پہچان لیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی، اس کے ہونٹ مسکرائے اور اس نے اپنے سیدھے ہاتھ کی انگلی میرے نچلے ہونٹ پر ہلکے سے دبائی۔ اس کھنڈر والی ملاقات میں رخصت ہوتے سمے اپنی وہی انگلی میرے ماتھے سے چھوئی تھی، وہ لمس ماتھے پر ہنوز تازہ تھا۔ یہ کیسا مرد تھا۔ فوجی مرد، فاتح فوجی یا دوسرے لفظوں میں قابض فوجی جن کو مقامی حریت پسند غاصب کہتے تھے۔ میں تو اس کے فوجی بوٹوں کے تلے آئی ہوئی مفتوحہ زمین تھی۔ جس کے کبھی ماتھے اور کبھی ہونٹ کو اپنی شہادت کی انگلی سے محض ہلکے سے چھو رہا تھا۔ مجھ مفتوحہ عورت کو وہ اپنے پیار سے کیوں فتح کرنا چاہتا تھا۔ فوجیوں کا پیار سے کیا واسطہ —؟ دیوانہ! میں اپنی ڈیوٹی سے غافل جانے کیا کیا سوچتی رہی تھی۔ ''ہیلو — ہاؤ آر یو'' اس نے سرگوشی کی۔ یوں بھی اس کی آواز میں نقاہت آ گئی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم نے آخر اپنے آپ کو توڑ پھوڑ لیا۔؟''

''میں نے تمہارے ملک کو توڑا پھوڑا۔ میری سزا ہے — اور سچ پوچھو تو یہ سزا بہت کم ہے۔''

جیسے ہی وہ کھڑے ہونے کے لائق ہوا، وہ اس کو لے کر گئے۔اس نے بائی بائی کہتے سے میری جانب اپنی داہنے ہاتھ کی انگلی بڑھائی۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے ماتھے یا ہونٹ کو چھوتی، میں نے اس کو پکڑ لیا اور اپنی جانب کھینچا۔انگلی کے ساتھ وہ بھی کھنچا چلا آیا اور میں اس سے بغل گیر ہوگئی عراقی انداز سے۔معانقہ کرنے کے بعد میں نے مغربی انداز سے اس کو ایک طویل بوسہ دیا۔

کیمپ سے لے جائے جانے کے بعد، اس کو نہ جانے کس کس کے آگے پیش کیا گیا۔بالآخر اس کو فرنٹ کے ناقابل قرار دے دیا گیا۔وہ ایک بار پھر آیا۔بہت سارے چھوٹے چھوٹے تحائف کے ساتھ جو سگریٹ، چیونگ گم، چاکلیٹ، ویفرس، بسکٹ، ڈسپوزایبل ریزرس اور شیمپوز پر مشتمل تھے جو اس نے عملے میں تقسیم کئے۔میرے لئے اک فلاور بکے لانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔جوان حالات میں قریب قریب ناممکن تھا۔میں نے اس کو دیکھتے ہی دعائیں مانگنی شروع کردیں۔''اللہ کرے وہ مجھے پروپوز کردے''۔میں جو اپنے اندر اس کی ہو چکی تھی۔ باہر اس کی ہو جانا چاہتی تھی۔''کاش! کسی گوری سے وہ بندھا نہیں ہو''— میری دعا قبول ہوئی۔اس نے مجھے عیسائی آداب کے مطابق زمین پر گھٹنا ٹیک کر پروپوز کیا۔اس نے عیسائی طریقے سے اور میری فرمائش پر اسلامی طریقے سے شادی کی۔

پہلے وہ خود اپنے ملک چلا گیا اور بعد میں مجھے بلوانے میں کامیاب ہوگیا لیکن ہماری شادی شدہ زندگی مختصر ثابت ہوئی۔اس کے بدن پر لگے ہوئے گھاؤ جو بظاہر بھر گئے تھے اسے لے کر چلے گئے۔جاتے جاتے وہ اپنے اور میرے بیٹے کی صورت میں اپنی نشانی دے کر مجھ سے رخصت ہوگیا۔ میں اس گورے فوجی کی نشانی کے ساتھ اپنے ملک لوٹ آئی اور ریڈ کراس والوں نے مجھے ایک بار پھر شریک کار بنا لیا۔میرا عراق لوٹنا، میرے ریڈ کراس کے بہی خواہوں میں زیرِ بحث آتا رہا۔میرے اپنے اندر بھی۔کیا اس کے اور میرے بیٹے کو اس کے ملک میں پرورش پانا چاہئے یا میرے ملک میں— فاتحوں کے درمیان یا مفتوحین میں—؟

☆☆☆

......انا......

پرانے سے بھی پرانے زمانے میں آدمیوں کی بستی میں ایک بچے نے جنم لیا۔ سر سے پیر تک وہ صورت، شکل، قد، کاٹھی اور بدن میں ویسا ہی تھا جیسے آدمی کا بچہ ہو۔ رنگت بھی عام سی نہ زیادہ گورا، نہ ہی کالا، البتہ اس کی ماں کے خیال میں وہ روتا بھی تو گود میں لینے پر چپ نہ ہوتا ''عجیب بچہ ہے لپٹاؤ تو اور زور سے رونے لگتا ہے۔'' بچہ دیکھنے میں پیارا تھا اس میں عام بچوں کے مقابلے میں زیادہ موہنی اور دل آویزی تھی۔ گھر کے سب لوگ اسے چمکارتے، چمٹاتے اور چومتے چاٹتے رہتے۔ خاندان کے باہر کے لوگ بھی اس پر صدقے واری جاتے۔ لیکن بچہ اپنے پر توجہ چاؤ اور چونچلوں کا روادار نہیں تھا۔ اس کا نام بھی پیارا سا اور مختصر تھا ''انا''۔

انا جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا اس کی بدیہی صلاحیتیں ظاہر ہوتی چلی گئیں۔ ہر معاملے میں اپنی عمر کے آگے رہا۔ بدن بھی تیز بڑھا اور ذہن بھی۔ اس نے بچپن کی بڑھوتری کے سارے مراحل غیر معمولی تیزی سے طے کئے۔ اس کی پیٹھ متوقع عمر سے پہلے سیدھی ہوئی، اور بیٹھنے اور رینگنے سے لیکر کھڑے ہونے، چلنے بھاگنے دوڑنے کے مرحلوں تک پہنچتے پہنچتے اس نے اپنی مستعدی اور پھرتی منوالی۔ دیکھتے دیکھتے لڑکا، بالا، نوجوان اور نوجوان سے ہٹا کٹا جوان بن گیا۔

انا نے ہر معاملے میں اپنے کو منوایا اور بہت جلد آدمیوں کی اس بستی کے علاوہ اس کا نام دور دور کی آدم بستیوں میں پہنچ گیا۔ وہ اپنے وقت کا ممتاز ترین جوان تھا۔ تمام جوانوں میں انتخاب۔ بستی کے چھوٹے، بڑے، بچے، جوان اور بزرگ اس پر ناز کرتے تھے، جوان اس کی نقل کرتے اور لڑکیاں اس پر مرتی تھیں۔ انا سب کی توجہ کا مرکز تھا لیکن خود کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ وہ قد کا زیادہ اونچا نہ تھا لیکن بستی کے سات فٹے جوان کو بھی اپنے آگے بونا محسوس کرتا تھا۔ جو اس کے ہم عمر قد کے ٹھگنے تھے ان کو وہ کیڑوں مکوڑوں کے برابر خیال کرتا تھا۔ اس کی سوچ اس طرح کی تھی ہی لیکن وہ ذہانت کے معاملے میں بھی کسی کو اپنا ہمسر تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس کی بات چیت کا محور بھی صرف اس کی اپنی ذات ہوتی تھی۔ اس کا ہر فقرہ 'میں' سے شروع ہو کر 'میں' پر ختم ہوتا تھا۔ بعض اوقات اس کی کسی معاملے میں کھلّم کھلاّ ہیٹی اور ہٹی ہو جاتی پھر بھی وہ اپنی ناک اونچی ہی رکھتا۔ اس کی ناک تھی بھی معمول سے کچھ زیادہ اونچی۔ لڑکیاں جو عام طور پر اس پر فدا تھیں اس کی اونچی ناک پر آپس میں خوب ٹھٹھول کرتیں۔ وہ تو خیر ہوئی کہ وہ بدن کا چھریرا تھا اگر ذرا بھی موٹا ہوتا تو اس کی ناک کو ہاتھی کی سونڈ سے ملا دیتیں۔

انا کی زندگی میں سب کچھ اچھا تھا ماسوا ایک کمی کے وہ ایک کسان خاندان کا جوان تھا اور زمینداروں کے لڑکے جو اسے کیڑے مکوڑے لگتے سماجی مرتبے میں اس سے بے حد اونچے مانے جاتے اور مُکھیا کے بیٹے تو بستی والوں کے لئے ایسے تھے جیسے شہزادے یا راج کمار۔ اکثر یہ ہوتا کہ انا اپنے ہم عمروں میں 'میں' کا رٹا لگائے بیٹھا ہے، مُکھیا کا بڑا بیٹا 'شیرا' اس جگہ پہنچ گیا۔ سب جوان 'انا' کو چھوڑ کر 'شیرا' سے للّو چپّو میں لگ گئے اور انا کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ حقیر کیڑا ہے جو زمین کے کسی سوراخ سے باہر نکل آیا ہے۔ 'انا' اپنے کیڑے پن کو بڑی شدت

سے محسوس کرتا۔ایک آدھ دن کے لئے اس کی ''میں، میں'' بھی بند ہو جاتی۔ایک دن انا کے لئے حالات نا قابلِ برداشت ہو گئے۔انا پر مرنے والی لڑکیوں میں ایک لڑکی تھی۔ جونی۔انا کو اس کی آنکھیں بہت پسند تھیں۔ان کو دیکھ کر وہ کچھ دیر کے لئے اپنی 'میں' فراموش کر دیتا۔ اس دن انا نے موقع نکال کر جونی کو مکئی کے کھیت میں جا گھیرا۔ابھی دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے ہوں گے کہ 'شیرا' اپنے آدمیوں کے ساتھ اس جگہ پہنچ گیا۔اس نے بھی جونی کو مکئی کے کھیت میں گھستے ہوئے تاڑ لیا تھا۔انا جونی کو بچانے کے لئے شیرا کے آدمیوں سے بھڑ گیا لیکن تھوڑی ہی دیر میں شیرا جونی کو لے اڑا اور اس کے آدمیوں نے انا کو ادھ موا کر کے چھوڑ دیا۔دوسرے دن پو پھٹے انا نے اپنی بستی کو الوداع کہہ دیا۔اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی بستیوں میں رہنے کی کوشش کی لیکن کسی بھی بستی میں حالات ایسے نہ ملے جو اس کی 'میں' کے لئے قابلِ قبول ہوتے۔کسی بھی بستی میں وہ جونی کی حفاظت میں ناکامی کے تاسف سے چھٹکارا نہ پا سکا۔آخر کار انا اپنی مسلسل ہجرتوں سے تھک گیا۔ایک صبح جب وہ کسی بستی سے دل برداشتہ ہو کر آگے کا سوچے بغیر چلا جا رہا تھا اسے ایک پہاڑی نظر آئی۔ پہاڑی زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ پہاڑی کی جانب تیز تیز چلنے لگا۔اس کے کندھے پر ایک پوٹلی تھی۔جس میں دو تین نان، گُڑ اور پیاز کے علاوہ ستو کا ایک پڑا تھا، دوسرے کندھے پر ایک جھولا جس میں پانی کا بدھنا لٹک رہا تھا۔سر پر ایک چادر کو اس نے شملے کی شکل میں باندھ رکھا تھا۔لاٹھی پوٹلی کے ساتھ دائیں کندھے سے ٹکی تھی۔ پہاڑی کے قریب آتے ہی اس پر چڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ پہاڑی بہت اونچی، بے ہنگم، اور بنجر تھی۔اس پر نہ تو پیڑ تھے اور نہ جھاڑیاں اور نہ ہی سبزہ۔خشک، برہنہ نوکدار پتھروں کے علاوہ جو سرمئی، سیاہ اور کہیں کہیں سفید رنگ اختیار کئے ہوئے تھے اس پہاڑی پر کچھ نہ تھا۔جیسے ہی انا نے پہاڑی کا رخ کیا، ایک دیہاتی نے اسے ٹوکا۔''پہاڑی پر نہ چڑھنا اس پر تو پہاڑی بکریاں بھی نہیں چڑھ پاتیں۔آج تک اس پر چڑھ کر کوئی دوسری جانب نہ اتر سکا اور نہ ہی لوٹ سکا۔'' دیہاتی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر اپنی بات پوی کی۔

''نہیں۔میں پہاڑی پر چڑھوں گا۔تم مجھے نہیں جانتے۔میں کون ہوں۔؟'' انا نے اکڑ کر کہا۔دیہاتی نے سر سے پاؤں تک اس کو دیکھا اور بولا،''میں تم کو اچھی طرح جانتا ہوں تم 'میں' ہو دیہاتی نے اس کا مضحکہ اڑایا۔

''تم مجھے کس طرح جانتے ہو۔؟ جب کہ میں تمہیں نہیں جانتا، ہم پہلی بار مل رہے ہیں۔''

''اس پورے علاقے میں تم کو سب جانتے ہیں تم ''میں'' ہو۔

''ہاں—ہاں—میں—'میں' ہی ہوں۔تم نے میری چڑ بنا لی ہے تو بنا لو— 'میں' ہوں سو ہوں۔''

دیہاتی اسے دیکھتا رہ گیا۔انا پہاڑی کے قریب ہو گیا۔

پہاڑی کے دامن میں ایک نالا تھا اس کے ساتھ لگی ہوئی ایک کُٹیا سی تھی۔انا جب اس کٹیا کے سامنے سے گزرا تو کٹیا کے اندر سے ایک بوڑھا پھونس آدمی باہر نکل آیا۔اور بولا۔

''نا بیٹا اس پہاڑی پر نہ جانا۔جو اس پہاڑی پر جاتا ہے لوٹ کر نہیں آتا''۔

''کیوں بابا— کیوں—؟ انا نے بلند آواز سے اس بوڑھے کو للکارا۔اس کی آواز سے بوڑھا چونکا، آواز میں کرختگی تھی جس کا وہ عادی نہ تھا۔بوڑھے نے اس کی آنکھوں کے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔انا اونچائی پر کھڑا تھا اور بوڑھا نیچے— پتہ نہیں اس کو انا کی آنکھوں میں کیا نظر

آیا، بوڑھا لرزا اٹھا اور انتہائی شفقت بھرے لہجے میں بولا۔ ''تیرا کیا نام ہے بیٹا۔''؟

بوڑھے کی شفقت سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اور جواب میں اپنا نام بتا دیا۔ اس کا نام سن کر بوڑھا کچھ دیر سکتے میں رہا پھر بولا۔

''اگر تو 'اَنا' ہے تو اوپر چلا جا پہاڑی تیری ہوئی''۔

اس درویش بوڑھے کا فقرہ انا کی سمجھ میں نہیں آیا لیکن اسے پہاڑی پر چڑھنے کی جیسے اجازت مل گئی تھی۔ وہ پہاڑی پر چڑھا۔۔ چڑھتا گیا۔۔ چڑھتا گیا۔ وہ پہاڑی انتہائی دشوار گزار خیال کی جاتی تھی۔ پہاڑی کیا تھی بے شمار اونچی نیچی نوکدار چٹانوں کا مجموعہ۔ انا نے جیسے ہی پہاڑی پر قدم رکھا اسے یوں لگا جیسے وہ غیر معمولی ہلکا ہو گیا ہو۔ اس کی شخصیت ہر قسم کے بوجھ سے عاری ہو گئی تھی۔ سارے وہ، سارے تم یاری، دوستی، رشتوں، ناتوں، قومی، وطنی، اخلاقی، دینی، ارضی، سماوی، زمانی، مکانی، حتیٰ کہ ماورائی بندھن اس سے جدا ہو گئے تھے۔ وہ سب سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ وہ صرف اور صرف 'میں' رہ گیا تھا۔ انا یہ نہیں جانتا تھا۔ لیکن جب 'وہ' ختم ہو جاتا ہے تو پھر 'میں' بھی نہیں رہتا۔ مجرد 'میں' غیر موجود 'میں' ہوتا ہے۔

آس پاس کے سارے علاقے میں یہ خبر پھیل گئی کہ انا جس کو عرف عام میں 'میں' پکارا جاتا تھا پہاڑی پر چڑھ گیا۔۔ دور دور سے لوگ آنا شروع ہو گئے، سرکار کے لوگ بھی آئے۔ پہاڑیاں چڑھنے والے اور اونچی اونچی چوٹیوں کو سر کرنے والے آئے۔ منظّم دستے آئے۔۔ پہاڑی سر کر لی گئی۔۔ اس کا چپّہ چپّہ دیکھ لیا گیا۔ لیکن 'انا' اس پہاڑی اور اس کے اطراف واکناف میں نہیں مل سکا۔ نہ ہی اس کا شملہ، لاٹھی، پوٹلی، بدھنا یا اس سے متعلق کوئی چیز کسی کو مل سکی۔ کوئی سراغ کسی کو نہیں ملا۔ بالآخر اس کی تلاش ختم کر دی گئی۔ البتہ جب بھی تیز ہوائیں چلتی ہیں تو پہاڑی میں ایسی آواز گونجنے لگتی ہے جیسے انا 'میں' 'میں' کی رٹ لگا رہا ہو۔۔ علاقے والوں نے اس پہاڑی کو 'انا' کے نام سے منسوب کر دیا تھا۔۔ سب اس پہاڑی کو 'انا' کی پہاڑی پکارنے لگے تھے۔ پہاڑی حقیقت میں انا کی ہو چکی تھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

☆☆☆

......مشورت......

''ہرصبح اور ہرشام، میں اپنے آپ کوٹٹولتی ہوں اور جب اپنے آپ کوموجود پاتی ہوں تو اطمینان کا سانس لیتی ہوں۔ وہ میری اولاد ہیں۔ ان کا شکوہ کرتے بھی لجا آتی ہے لیکن یہ عجیب ہیں۔ عقل اور دانش کے دعوے کرتے ہیں لیکن اتنے احمق ہیں کہ جس ڈال پر بیٹھے ہیں اسی کو کاٹنے میں لگے ہیں۔ یہ بیچارے بھی کیا کریں کیونکہ فساد اور لہو آشامی ان کی جینز میں موجود ہے اگر سب کی جینز میں نہ بھی ہو تو بیشتر کی جینز میں ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہئے کہ وہ اپنا بھلا برا بھی سوچنا ترک کر دیں۔ میں ماضی بعید کی اس ساعت کو کیسے بھول سکتی ہوں جب میں موجود تھی اور یہ نہ تھے۔ اس ساعت کو یہ بھولے رہتے ہیں۔ میں کبھی نہیں بھولتی۔ ان کی پیدائش اور تخلیق کا موضوع زیرِ بحث تھا۔ ان کے خلاف ووٹ پڑ چکے تو ان کے حق میں کاسٹنگ ووٹ نے فیصلہ کروا دیا۔ مخالفت میں ووٹ ڈالنے والوں میں ایک اَڑ گیا۔ واک آوَٹ کر گیا یا اسکوراندۂ درگاہ قرار دیکر اور ایک لمبی رسی سے باندھ کر۔ باہر دوسروں کو ورغلانے اور راہِ راست سے بھٹکانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا۔ اب اس کو میری غلطی کہو یا بھولپن، میں نے ان کے لئے اپنی کوکھ اور گود دونوں ہی پیش کر دیں یا یوں کہو بغیر کسی چون و چرا قبول کرلیا۔ اس سمے میرے وہم وگمان میں بھی نہیں آیا کہ یہ انا پرست، فسادی، خون آشام، تخریب کار اور جنگجو خود میرے بھی در پے ہو جائیں گے۔ ان کی بقا کو جو خطرات لاحق ہیں وہ ان سے کافی حد تک آگاہ ہو گئے ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں بہت جلد وہ پانی اور غذائی قلّت سے دوچار ہونے والے ہیں۔ فضائی آلودگی ان پر منڈلا رہی ہے۔ کسی بڑی جنگ سے ان کو حالات نے بچا رکھا ہے تو انہوں نے چھوٹی جنگوں کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ استعمار اور استحصال شانہ بشانہ مصروف ہیں۔ (جنگ وجدال اور لوٹ گھسوٹ میں) ایسی صورت حال میں اپنے وجود اور اپنی بقا کے لئے تردّد نہ کروں تو اور کیا کروں۔؟''

''تم نے بیکار ہی اتنی لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی۔ تمہارے خدشات بے بنیاد نہیں۔ میں ان کو حقیقی مانتا ہوں۔ میں ان سب حالات سے آگاہ ہوں کیونکہ میں روشنی ہوں۔ مجھ سے کچھ بھی چھپا ڈھکا نہیں رہ سکتا لیکن میں یہ سوچ کر حیران ہوں کہ تم اتنی پریشان اور فکرمند کیوں ہو' جب کہ مذکورہ سارے مسائل کا حل خود تمہارے ہاتھوں میں ہے۔''

''میرے ان مسائل کا حل میرے اپنے پاس ہے۔ میرے اپنے ہاتھوں میں۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔؟۔''

''تو کیا میں نے غلط کہہ دیا۔؟ کیا تمہارے مسائل کا حل تمہارے اپنے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ سیدھی سی بات ان سے تمہیں خطرہ ہے تم ان کا خاتمہ کر دو یا کروا دو۔ تمہارا مسئلہ ختم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ آیا سمجھ میں۔''

''وہ کس طرح۔؟''

''وہ اس طرح کہ تم میرے قریب آ جاؤ اتنی مدت کے لئے کہ تمہارا ہدف حاصل ہو جائے۔ جو تمہارے درپے ہیں، سب کے سب ختم ہو جائیں۔''

''میں تمہارے قریب ہو گئی تو۔۔ یہ بیچارے تمہاری تپش سے جل جائیں گے۔
ہے ہے۔ یہ مجھ سے دیکھا نہ جائے گا۔''

''کیوں۔؟''

''میں ان کی ماں جو ہوں۔ ایک بات اور ان میں سب کے سب قابیل نہیں ہیں۔ جہاں قابیل ہیں وہاں ہابیل بھی ہیں۔ جہاں راون ہیں وہاں رام بھی ہیں''۔

''تمہارا دکھڑا سُن کر میں نے تمہیں مشورہ دینے کی غلطی کر دی۔ مجھے مشورہ دینے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے تھا کہ تم ماں ہو۔ میں ماؤں کو مشورہ دینے کا اہل نہیں ہوں۔''

''وہ کیوں۔؟''

''میں بانجھ ہوں۔!!''

☆☆☆

......آپ......

آپ کی جانب سے لحاظ، مروت، محبت اور امتیازی سلوک کا مظاہرہ پہلی مرتبہ اس دن ہوا جب میں دوپہر کی چھٹی کے دوران گورنمنٹ پرائمری ماڈل اسکول، چادر گھاٹ کے باہر اکیلا بے مقصد گھومتا ہوا سڑک سے نیچے اتر کر گھاٹ کی طرف چلا گیا تھا۔ آج جب میں اپنے بچپن کے اس دن کو یاد کرتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ چادر گھاٹ کتنی اہمیتوں کا حامل تھا۔ یہ موسیٰ ندی پر بنا ہوا تھا۔ وہی موسیٰ ندی جس کا تعلق گولکنڈے کے قطب شاہی خاندان کے شاعر شہزادے قلی قطب شاہ سے ہے۔ اس شاعر شہزادے کو بھاگ متی سے عشق ہو گیا تھا جو گولکنڈہ سے خاصے فاصلے پر وہ موسیٰ کے کنارے کسی چھوٹے سے گاؤں میں رہتی تھی۔ شہزادے نے اس کے لئے ایک نیا شہر آباد کیا اور اس نئے شہر کا نام اپنے نام کی جگہ اپنی محبوبہ کے نام پر بھاگ نگر رکھا۔ وقت اور تاریخ نے اس نام کو مزید تبدیلیوں سے دوچار کیا۔ وہ بھاگ نگر سے حیدرآباد میں بدلا اور سلطنت آصفیہ کا پایہ تخت قرار دیا گیا۔ وہ گھاٹ جو بھاگ نگر کو موسیٰ ندی کی آئے دن کی طغیانیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے بنایا گیا۔ وہ گھاٹ تھا۔ اس گھاٹ کے ایک جانب مندر اور دوسری جانب شمشان تھا۔ مسلمان ہر سال دس محرم کی شام اس گھاٹ پر اپنے علم ٹھنڈے کرتے، خاص طور پر بی کا علم جس کو ہاتھی پر اس طرح لایا جاتا کہ آگے آگے نشان کا ہاتھی، اس کے عقب میں ماتمی دستے اور جمیع خلائق ماتم کناں اور زمین وآسماں کو اپنی فریاد میں لپیٹی ہوئی ایک گونج'' ابن الزّہرہ واویلا''۔

ہر سال اسی گھاٹ سے'' موریا'' کی گونجوں کے ساتھ 'گنیش جی' کو پانی کی لہروں پر سوار کیا جاتا۔ اسی گھاٹ کے قریبی میدان میں دسہرے کے جلوس کا اختتام ہوتا اور ہر سال کے نئے راون کو زور وشور، گونج اور گرج کے ساتھ جلایا جاتا۔ میری زندگی کے تعلق سے اس گھاٹ کی اہمیت اس سبب سے ہے اور رہے گی کہ میری آپ سے پہلی ملاقات اسی چادر گھاٹ پر ہوئی تھی۔ اس ملاقات سے قبل یعنی ایک دن پہلے میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ قریبی پارک گیا تھا۔ بھائی جان اپنے دوستوں کے ساتھ گپ شپ میں مشغول تھے۔ میں تنہا ڈولتا پھر رہا تھا کہ میرا ایک ہم جماعت نظر آیا۔ میں اس کے ساتھ ہو گیا۔ وہ اپنے چچا کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اس کے چچا مندر گئے ہوئے تھے۔ شام پڑنے والی تھی۔ پرندے پارک کے پیڑوں میں شام کا شور مچانے لگے تھے۔ مندروں کی گھنٹیاں بھی تیزی سے بجنے لگی تھیں۔ شام کے روشن، نیم تاریک جھٹپٹے میں میرے دوست نے مجھے اپنے چچا سے ملایا۔ ان کی آنکھوں میں اک ایسی چمک تھی جس نے میری آنکھوں ہی کو نہیں بلکہ مرے وجود کو اپنی جانب کھینچ لیا۔

'' تیرے اندر تو من موہن کرشن کنہیا ہیں۔ تجھ میں بڑی موہنی ہوگی مگر رشتے داروں سے کشٹ اٹھائے گا۔ ساری عمر حاسدوں کی زد میں رہے گا۔ میں جلدی میں ہوں۔ تیرے اندر کے مہاراج کو پرنام'' جلدی جلدی یہ کہہ کر یا اس طرح کی بات اپنے الفاظ میں۔۔۔ میرے

قلب روح میں پہنچا کرانہوں نے اپنے بھتیجے کا ہاتھ پکڑا، اندھیرے اجالے کے بیچ، مندر میں بجائی جانے والی گھنٹیوں اور پیڑوں پر چیخ پکار کرتے پرندوں کی آوازوں کے درمیان وقت کے اُڑتے غبار میں تحلیل ہو گئے۔

میں اپنے بچپن کے جس خاص دن کی بات کر رہا تھا۔ اس دن اسکول کی دوپہر کی چھٹی میں پہلی بار۔تنہا۔گھاٹ پر آیا تھا۔گھاٹ کا فرش موٹے موٹے پتھروں سے بنا تھا۔ پانی کے روز روز کے تھپیڑوں نے ان کو چکنا کر رکھا تھا۔ان پر ہری کالی کائی بھی کہیں کہیں جمی ہوئی تھی۔ موسیٰ ندی اس دن ہلکی طغیانی پر تھی اور پانی گھاٹ کے اوپر بھی بہہ رہا تھا۔دوپہر کی چھٹی کے بعد مجھے اسکول واپس جانا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو بہت روکا گھاٹ پر آگے قدم بڑھانے سے لیکن میرے قدم آگے بڑھتے گئے۔ جلد ہی میں بیچ گھاٹ پر رکا کھڑا تھا۔ میرے جوتے اور موزے گیلے ہو چکے تھے اور پانی میرے خاکی نیکر کو بھگونے میں مصروف تھا۔ آگے بڑھنا امکان سے باہر تھا اور واپس چلنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ یا تو میں خوف زدہ ہو گیا تھا یا پانی کا زور بڑھ گیا تھا۔ دونوں میں سے ایک پیر بھی اٹھاتا تو پانی مجھے گرا دیتا اور اپنے ساتھ بہا لے جاتا۔ میری ٹانگیں جمائے رکھنے کے باوجود اندر سے لرز رہی تھیں۔ خوف دہشت میں بدل گیا تھا۔ میں نے اپنے چاروں جانب نظر دوڑائی۔ گھاٹ کے کنارے لوگ تھے لیکن سب اپنے اپنے کاموں میں مگن تھے اور مجھ سے خاصے فاصلے پر تھے۔ سڑک پر لوگ تھے لیکن سڑک انہیں چلائے جا رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ حلق پھاڑ کر، بلند آواز میں چلاؤں، مدد کے لئے آواز دوں۔ شاید کوئی سُن لے لیکن پتہ چلا کہ آواز میرے حلق سے نکل ہی نہیں رہی تھی۔ پھر بھی میں نے بغیر آواز کے پکارا میری ماں نے مجھے قرآن مجید پڑھاتے سمے بتایا تھا کہ اللہ میاں کو بغیر آواز کے بھی پکارا جا سکتا ہے۔ اچانک لوگ میری جانب لپکنے لگے۔ چھوٹے، بڑے، لمبے، ناٹے، موٹے، دبلے، کالے گورے، سانولے۔ بھانت بھانت کپڑوں میں ملبوس لوگ۔ دھوتی یا نیکر پہنے نیم برہنہ لوگ۔ عورتیں سب کی سب ساریوں میں۔ میرے خیال کے مطابق میری مدد کرنے اور مجھے اس گھاٹ سے لے جانے کے لئے آ رہے تھے۔ میں اس دہشت کے عالم میں یہ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ میری بے صدا آواز ان تک کیسے پہنچی ہو گی۔ میں نے دیکھا اس ہجوم میں سب سے آگے جو آدمی تھے۔ قدرے فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اپنی ہتھیلیاں ڈنڈوت کرنے کے انداز میں جوڑی ہوئی تھیں ان کے پیچھے جو کوئی آتا اسی پوجا کے انداز میں کھڑا ہو جاتا۔ دو ایک آدمی خاص آسن میں بیٹھ بھی گئے تھے تھوڑی ہی دیر میں خاصا ہجوم ہو گیا تھا۔ اتنے سارے لوگوں کو قریب پا کر میں دہشت سے باہر آ گیا تھا۔ میری ٹانگیں اندر سے کپکپانا بند کر چکی تھیں، بوٹ، گیلے موزے اور بھیگتا نیکر بھی بدن کو تنگ نہیں کر رہے تھے۔ اور سب سے بڑی اور زندگی کی سب سے اہم بات۔۔ میں نے آپ، کو دیکھ لیا تھا۔ آپ میرے بالکل قریب، مجھ سے لگے ہوئے، زور مارتے ہوئے جھاگ دار پانی پر کھڑے ہوئے تھے۔ آپ نے اپنا خوبصورت پھن پھیلایا ہوا تھا۔ آپ میرے ساتھ کھڑے ہوئے ایک حاکمانہ شان سے اپنے پرستاروں کو دیکھ رہے تھے جیسے ان کی سلامی قبول فرما رہے ہوں۔ میں آپ کو دیکھتا رہا، ایک محویت، ایک استغراغ کے عالم میں، شاید اس سمے مجھے آپ کے ماسوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور نہ ہی سجھائی دے رہا تھا، پھر۔۔ اچانک سب کچھ تھم گیا۔ آپ گھاٹ کے نیچے یا فضا میں غائب ہو گئے۔ میں جو آپ کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ آپ کے غائب ہونے کو محسوس نہ کر سکا۔ مجھے یقین ہے۔ آپ کے اتنے سارے پرستاروں

میں سے جو وہاں جمع تھے کسی نے بھی آپ کو غائب ہوتے سے نہیں دیکھا۔ جیسے ہی آپ تشریف لے گئے، آپ کے پرستاروں کے لب ہلنے بھی بند ہو گئے۔ آپ کا ہر پرستار اپنے اپنے انداز میں آپ کی پوجا کر رہا تھا۔ ان کے ہونٹوں سے الگ الگ شبدھ بلند ہو رہے تھے۔ الگ الگ جاپ گونج رہی تھی۔ سب آوازیں، ہم آمیز ہو کر ایک صوتی اکائی بنا چکی تھیں جو زمین اور آسمان کے درمیان کسی سیڑھی کی مانند کھڑی ہو گئی تھی۔ آپ کے جانے کے بعد کی خاموشی نے اچانک وہ سیڑھی گرا دی اور یوں لگا جیسے ایک بے آواز جھٹکے کے ساتھ کوئی قطعہ آسمان نیچے آ، پڑا۔۔۔ گھاٹ پر پانی کا زور بھی ٹوٹ گیا اور وہ کافی نیچے ہو کر بہنے لگا۔ آپ کے پرستار میری جانب متوجہ ہو چکے تھے۔ وہ باری باری مجھے ڈنڈوت کرتے، میرے پیر چھوتے اور الٹے پاؤں لوٹتے جاتے تھے۔ کسی نے بھی میری جانب پیٹھ نہیں کی۔ پلک جھپکتے میں وہ سب مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔ کسی نے مجھ کو مخاطب بھی نہیں کیا۔ اکیلا پڑنے کے ساتھ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میری نیکر سوکھ چکی تھی۔ میرے جوتے اور گیلے موزے خشک ہو چکے تھے۔ میں جلدی جلدی اسکول روانہ ہو گیا۔ کلاس میں دیر سے پہنچا لیکن ٹیچر نے مجھے یا تو دیکھا ہی نہیں یا دیکھ کر بھی چشم پوشی کر لی۔

آپ سے اس پہلی ملاقات کے بعد دوسری۔ سنگارینی کے کوئلے کے کانوں سے لگی ہوئی ایک گونڈ بستی میں ہوئی۔ وہاں میں اپنی ماں کے ساتھ چھ، سات روز ٹھہرا تھا۔ کچھ زمین کی خرید و فروخت کا معاملہ تھا۔ اس بستی میں لوگ درختوں پر بنائے ہوئے مچانوں پر رہتے تھے۔ ہمیں بھی ایک مچان دے دیا گیا تھا۔ بستی والوں کے خبر دار کرنے کے باوجود میں مچان کے نیچے اِدھر اُدھر بے مقصد پھرا کرتا تھا۔ اس بستی کے لوگ ہفتے میں ایک دن (دن یاد نہیں) مچان سے نیچے ہی نہیں اُترتے تھے۔ یہ مشہور تھا کہ اس ایک دن شیر، چیتے اور دوسرے درندے بستی میں داخل ہو سکتے تھے۔ باقی دنوں میں کسی جادو ٹونے کی شکتی سے بستی کے بڑے جادوگر نے ان کو بستی میں داخل ہونے سے روکا ہوا تھا۔ اس دن کے لئے میری والدہ کو اور مجھ کو مچان سے نیچے اترنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ میری والدہ اپنے پاندان اور لوازمات کے ساتھ بستی میں گئی تھیں۔ گونڈ عورتیں ان سے پان بنوا کر چبانے اور اپنے منھ لال کروانے ہمارے مچان پر آتی تھیں۔ گونڈ کلچر کے مطابق اس زمانے میں (دوسری جنگ عظیم سے پہلے) کنواری لڑکیاں مادر زاد برہنہ رہتیں البتہ شادی شدہ اور معمر خواتین دونوں رانوں کے درمیان لنگوٹی سی باندھے رہتیں۔ سینہ ڈھانکنے کا قطعی رواج نہیں تھا۔ مجھے یاد نہیں ان دنوں میری عمر کتنی تھی لیکن میری آنکھوں کو گندمی اور سونے کی رنگت والی جوان لڑکیوں کے بدن بہت بھلے لگتے۔ خاص طور پر جب وہ کنویں سے پانی کھینچتیں یا جنگل سے جلانے کی لکڑیاں کاٹ کر لاتیں۔ مجھے آج بھی یاد ہے جن دنوں کی بات میں کر رہا ہوں حکومتی سروے کے دو افسر اپنے ملازم کے ساتھ اس بستی میں آئے تھے۔ ان کے اس ملازم نے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر بستی کی سمت آنے والی لڑکی کو پکڑ لیا تھا۔ وہ غائب ہو گیا یا کر دیا گیا۔ سروے والوں کو اس کی سر بریدہ لاش ایک برساتی نالے کی جھاڑیوں میں پڑی ملی۔ سر نہیں مل سکا۔ گونڈوں نے اس کے بارے میں زبان نہیں کھولی۔ سروے والے بغیر سر۔ لاش لے کر چلے گئے۔ کچھ دن بعد اس ملازم کا سر ایک پیڑ سے لٹکا ہوا پایا گیا جو پرندوں اور چیونٹیوں کی غذا بنتا رہا اور پھر بے نشان ہو گیا۔ جس دن والدہ کے ضروری کام نمٹ گئے اسی دن کی بات ہے میں دو مرغوں کی لڑائی دیکھ رہا تھا۔ اچانک دونوں نے لڑنا بند کر کے عجیب آواز میں بستی کی ساری مرغیوں کو خبردار کرتے ہوئے راہ فرار اختیار کی۔ ''یہ مرغے اس طرح ڈر کر کیوں بھاگ گئے۔'' میں نے سوچا۔ آسمان کو دیکھا تو

وہاں کوئی بڑا پرندہ یا چیل بھی موجود نہ تھی۔ ابھی میں خوف زدہ مرغوں کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ میرے عقب سے سنہری رنگت والی گونڈہ حسینہ نمودار ہوئی اور اس ظالم نے ''آپ'' کی گردن کو پشت سے پکڑ کر آپ کو دور اچھال دیا اور مجھے اپنے بدن سے چمٹا لیا کچھ اس طرح کہ میرا چہرہ اس کی ننگی جھانگوں کو چھو رہا تھا اور میرے بازو اس کی پتلی کمر کے گرد تنگ حصار بنا رہے تھے دیر تک میں اسی طرح کھڑا رہا۔ اس کی جھانگوں کی نمی اور عجیب سی بو میرے چہرے اور ناک میں داخل ہوگئی تھی۔ میں جب بڑا ہوا تو اس بو اور نمی کو لگ بھگ اس ہی کی عمر تک پہنچنے پر اپنے پورے وجود میں موجود پایا، جوان عورت کے اولین جنسی اور حسّی ادراک کی صورت میں۔ اس نازک سے بھی مجھے آپ کی جانب سے غفلت کا احساس نہیں ہوا۔ نہ جانے کیوں میرے اس وقت کے مشاہدے میں مجھے آپ ایک خاص انداز میں مسکراتے ہوئے نظر آئے جیسے میری اس حالت سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ اس نادان گونڈ لڑکی کی گستاخی کو آپ نے نظر انداز کر دیا تھا۔ آپ کو اپنے قریب محسوس نہ کرنے اور آپ کے درشن نہ لینے کا مجھے افسوس رہا جب کہ لڑکی کو یہ طمانیت ملی کہ اس نے مجھے 'آپ' سے بچا لیا تھا۔ آپ کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد اس نے اپنی ننگی کمر کو میری باہوں کے حلقے سے چھڑایا اور میرے سر اور چہرے کو اپنی جھانگھوں سے جدا کرتے ہوئے وہ کسی پھولوں کی ڈال کی طرح لچک لچک گئی۔۔ اور۔۔ پھر وقت مجھے لے اڑا۔

اس رات طوفانی بارش ہوئی تھی۔ کراچی کی قدیمی قوم 'کلاچی' کے لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ تقسیم ہند کے بعد ہندستان سے آ کر پاکستان اور کراچی میں بس جانے والے پناہ گیروں، پناہ گزینوں، مہاجروں، نئے سندھیوں اور مکڑوں کے ساتھ طوفانی بارشیں آئی تھیں وگرنہ کراچی میں بارش شاذ شاذ ہی ہوتی تھی۔ بارش اتنی تیز تھی کہ شمالی ناظم آباد کے دامن میں ابھرتی ہوئی ایک آبادی کے مکانوں کو نصفا نصف ڈبو دیا تھا۔ اس رات میرے بائیں پاؤں کے پنجے میں کوئی ڈس گیا۔ میں نے گھر کے لوگوں کو بتا دیا اور سب نے ڈسنے کے مقام کو دیکھا اور یہ خبر آس پاس کے گھروں میں پہنچ گئی۔ مجھے دیکھنے کے لئے کچھ لوگ جو بظاہر اجنبی تھے، تیز بارش اور گھٹنوں پانی میں آئے۔ ان لوگوں میں دو ایک ماہرین بھی تھے۔ ان لوگوں نے ٹارچ کی مدد سے (بجلی غائب تھی) ڈسے ہوئے مقام کا معائنہ کیا ور کہا ''شہر کے بڑے ہسپتالوں تک پہنچانے تک بھی اس مارگزیدہ کا بچنا محال نظر آتا ہے'' جاتے جاتے وہ تاکید کر گئے ''مارگزیدہ کو سونے نہیں دیا جائے'' لیکن مجھے بیدار رکھنے کی ساری تراکیب ناکام ہوگئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجھ پر غفلت طاری ہوگئی۔ اس نیم بے ہوشی اور غفلت کے عالم میں جب میرے تیماردار مجھے چھوڑ گئے ''آپ'' تشریف لائے، ڈسے ہوئے مقام، بائیں پیر کی انگوٹھے کے برابر والی انگلی پر اپنا منہ رکھا۔ اس کے ساتھ ہی میں بیدار ہوگیا، نئی توانائیوں کے ساتھ اور مجھے خود واضح طور پر محسوس ہوا جو زہر میرے بائیں پیر سے کمر تک کی خون کی نسوں میں پہنچ چکا تھا۔ پیروں کی جانب لوٹا اور ڈسے ہوئے مقام تک پہنچ کر، میرے بدن سے خارج ہوگیا۔ پو پھٹے مسجدوں سے اذانیں بلند ہوئیں۔ میں نے سُنیں، دھیمی آواز میں جواب دیا اور رب کا شکر ادا کیا ''میں زندہ تھا'' آپ زندگی مجھے لوٹا کر منظر سے ہٹ چکے تھے۔ وقت مجھے لے کر اڑ گیا۔

تھر (پاکستان) کے ریگستان سے انتظامیہ نے میر پور خاص اور سانگھڑ کے ضلعے تھے۔ ان دنوں میں سانگھڑ کے سرکاری ڈگری کالج کے ہوسٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ ہوسٹل کے وسیع و تاریک صحن کو پار کر کے، اس جگہ سے جہاں ہوسٹل کی دیوار توڑ کر رستہ سا بنایا گیا

تھا، میں ہائی اسکول کی کینٹین جا کر سحری کھاتا اور چائے پیتا تھا۔ کالج کا کوئی کینٹین نہیں تھا۔ نیم تاریک اور نیم روشن فضا میں، مجھے یہ محسوس ہو جاتا کہ رینگنے والی مخلوق جس کے لئے تھر پورے پاکستان میں مشہور ہے مجھے راستہ دینے کے لئے، مجھ سے از خود دور ہوتی جارہی ہو۔ اب ایسا بھی نہیں کہ میں 'آپ' کو بھول گیا تھا اور یہ نہ سمجھتا تھا کہ میری آپ ہی حفاظت کر رہے تھے۔

ان ہی دنوں ایک ہفتے کی چھٹی پر سکھر (پاکستان) فرک ہلس کے ریلوے کوارٹرس میں ٹھہرنا پڑا۔ میرے قیام کے دوسرے ہی دن اس بستی میں افراتفری مچ گئی۔ عورتیں اپنا گھر بار چھوڑ دوسروں کے کوارٹروں میں گھستی پھرتیں اور مرد لاٹھیاں برساتے، اِدھر اُدھر حیران پھرتے لیکن وہ رینگنے والی ہستی کسی کی لاٹھی یا پتھر تلے نہیں آتی۔ اس طرح دو دن گزر گئے۔ دن بھر بھاگ دوڑ مچتی اور رات میں دو دو، چار چار کوارٹروں کے مکین، بوڑھے، بچے اور عورتیں ایک ایک کوارٹر میں پڑ رہتے اور ان کوارٹروں کے جوان مرد رات بھر باری باری پہرہ دیتے۔ اس تمام صورت حال سے، ابتدا میں تو میں نے ایک اجنبی کی سی لاتعلقی رکھی لیکن تیسرے دن، دوپہر کے وقت جب میرے لاٹھی بردار میزبان نے اس ہستی کی مہمات سے بھرپور داستان سنائی تو اچانک مجھ میں نفسیاتی تبدیلی واقع ہوگئی۔ میں نے اپنے میزبان سے پوچھا۔

''اس وقت وہ کہاں ہے۔؟''

''سامنے والے کوارٹر میں کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔''

''ذرا میں بھی دیکھوں۔'' یہ کہہ کر میں اپنے لاٹھی بردار میزبان کے ساتھ ہولیا۔ اصولی طور پر تو اس بھلے آدمی کو مجھے ساتھ لیکر جانا ہی نہیں تھا لیکن اس بندے کی سوجھ بوجھ کو کچھ ہو گیا تھا یا شاید اس کے سر پر 'ہیرو' بننے کا بھوت مسلّط ہو چکا تھا۔ مہم جوئی اس پر طاری ہوگئی تھی۔ اس نے مجھے متعلقہ کوارٹر کے سامنے لا، کھڑا کیا۔ کوارٹر کا دروازہ کھلا تھا۔ مکین کوارٹر سے فرار ہو چکے تھے۔ دروازے سے میں نے جھانکا۔ چھوٹے سے پکّے صحن کے ساتھ ہی دائیں جانب شاید چھوٹا سا ''کچن'' تھا اور کچن کی دیوار کے ساتھ ایک تنگ راہداری کوارٹر کے اندر عقبی حصے کی جانب جاتی تھی۔ جس جگہ یہ راہداری ختم ہوتی تھی وہاں وہ کنڈلی مارے، گردن اٹھائے، پھن پھیلائے بیٹھا تھا۔ اس کی ہلتی ہوئی گردن اور بغیر پلکوں والی متحرک آنکھوں سے غصّہ ظاہر ہو رہا تھا۔ میں اپنے میزبان کی سوچ کے زیر اثر آچکا تھا۔ اگرچہ مجھے ہیرو کہلوانے کا کوئی شوق نہ تھا پھر بھی میں کوارٹر کے اندر داخل ہوگیا۔ میرے میزبان نے مجھے نہیں روکا۔ وہ لاٹھی لئے دروازے پر کھڑا دیکھتا رہا۔ اس نے اس پر بھی دھیان نہیں دیا کہ میں کوارٹر میں بالکل نہتا داخل ہوا تھا۔ وہ سچ مچ کسی نشے میں تھا۔ کوارٹر میں داخل ہو کر میں نے غیر ارادی طور پر، کچن کی دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی جلانے کی لکڑیوں میں سے ایک لکڑی اٹھالی جو بہ مشکل دو ڈھائی فٹ لمبی ہوگی۔ وہ لکڑی دونوں جانب سے چری ہوئی تھی اور اس کے سروں سے سخت اور نوکدار ریشے باہر نکل رہے تھے۔ آگے بڑھ کر۔ میں راہداری کے دوسری جانب رکھے ہوئے ایک چوبی کھوکے پر اُکڑوں بیٹھ گیا۔ اس وقت جو میں اتنی واضح تصویر کشی کر رہا ہوں تو یہ بھی بتا دوں گرمی کی اُس دوپہر میں جو کچھ میں نے کیا قطعی غیر واضح تھا۔ بہت ممکن ہے جو کچھ میں نے کیا وہ مجھ سے سرزد ہوا ہو۔ میں نے کیا نہ ہو۔

مجھے اس کھوکے پر زیادہ دیر تک بیٹھنا نہیں پڑا۔ میں نے دیکھا اس نے اپنی کنڈلی کھولی، پھن کو سکیڑا، اٹھی ہوئی گردن کو زمین کے برابر کر کے پھیلایا اور آن کی آن میں کھوکے تک آپہنچا۔ جیسے ہی وہ قریب آیا میں نے اس کے سر کو لکڑی کے کھٹے پھٹے سرے کے نیچے دبا دیا۔

افسوس اس سمے یہ نہ سوچ سکا کہ ایسا ہونا ممکن نہ تھا اگر آپ کا حکم شامل حال نہ ہوتا۔ اس نے آپ ہی کے حکم پر مجھ پر جھپٹنے اور مجھے ڈسنے کے بجائے اپنے سر کو میری لکڑی کے نیچے رکھ دیا اور بعد میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میرا میزبان اس کو قابو میں دیکھ کر اس دوران کوارٹر کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ ایک جانب میرا میزبان اس پر اچھل اچھل کر اپنی لاٹھی سے وار کر رہا تھا تو دوسری جانب ’آپ‘ کا تابع فرمان وہ رینگنے والا اپنا دفاع کئے بغیر اپنے حسین جسم پر لاٹھی کی ضربات لے رہا تھا یہ سانحہ تھوڑی سی دیر میں ختم ہو گیا۔ اس کے بعد میں اپنی قیام گاہ پر جا پہنچا لیکن میرا میزبان اس مردہ جسم کو اٹھائے اٹھائے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا ادھر ادھر پھرتا رہا۔ جس وقت وہ مجھ سے دوبارہ ملا ۔میں اپنا سامان پیک کئے بیٹھا تھا۔ میرے لئے اب اس علاقے میں مزید قیام دشوار ہو گیا تھا۔

جون کی دس تاریخ سال 1973ء یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ میں اس کا سوگ ہر سال مناتا ہوں۔ سر پیٹتا ہوں، سینہ کوبی کرتا ہوں اور کمرہ بند کر کے چیخ چیخ کر روتا ہوں۔

☆☆☆

......اللہ میاں......

عہدِ طفلی تو نہیں کہوں گا البتہ بچپن ہی سے حیدر آباد کے جس چہرے سے مجھے واسطہ پڑا، وہ مسجدوں والا حیدر آباد تھا۔اس حیدر آباد سے میرا تعارف میرے والد کی وساطت سے ہوا۔وہ فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد مسجدوں کے ہو رہے تھے۔میں ان کی انگلی پکڑ کر مسجد جاتا تھا۔ پہلی بار مسجد جانے کا تجربہ اب بھی واقع ہوتا رہتا ہے۔چھوٹی خوبصورت عمارت—— گھروں اور بنگلوں سے بالکل مختلف—— چھت تو بالکل ہی بدلی ہوئی۔ ہرے رنگ کا گول گنبد جس کے بیچوں بیچ رنگ کا کلس جو سورج نکلنے سے قبل کی نیم رشن، نیم تاریک شبنمی فضا میں، میرے بچکانہ ذہن میں ایک انجانا خوف پیدا کر رہا تھا۔اس عمارت کی ایک اور امتیازی خصوصیت، اس کے بلند و بالا مینار تھے جو شاید آسمان کو چھونے کی انسانی خواہش کا استعارہ تھے۔اس وقت تک اللہ میاں کے بارے میں میری معلومات کچھ یوں تھی کہ وہ آسمانوں میں کسی جگہ، کسی اونچے تخت پر بیٹھتے ہیں۔تخت پر ہی نہیں بلکہ تخت پر بچھی ہوئی کسی شاندار کرسی پر اور نورانی فرشتے ہمہ وقت ان کی خدمت میں حاضر رہتے ہیں۔ میں ان کے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔والد کے ساتھ کے باوجود میں ڈر سے کانپ رہا تھا۔جس دروازے سے ہم دونوں، باپ- بیٹے داخل ہوئے وہ عام دروازوں سے قدرے کشادہ تھا۔اس کا ایک پٹ کھول دیا گیا تھا، ایک ہنوز بند تھا۔مسجد یعنی اللہ کے گھر کا صحن سنگ ِسیلو کا تھا۔دروازے کے پاس ہی ایک کیاری سی تھی۔اس کیاری میں ایک موٹا خوب تناور، جنگلی بادام کا درخت اپنی موٹی موٹی شاخیں اور پتلی پتلی ٹہنیاں، مسجد کی چھت سے بھی بلند تر فضا میں چاروں طرف پھیلائے کھڑا تھا۔ان ٹہنیوں میں لمبے چوڑے اور دبیز دبیز پتے لگے ہوئے تھے اور جگہ جگہ موٹے موٹے ہرے، جامنی دھبوں والے بادام دیکھنے والوں کی نظروں کو اپنی جانب متوجہ کر رہے تھے۔چند ایک نیچے بھی گرے پڑے تھے۔وہ پھٹے پھٹے تھے۔ان کے اندر کا سرخ، جامنی، سخت—— لیکن رس بھرا ریشہ باہر جھانک رہا تھا۔اندر داخل ہو کر میں نے اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔میری آنکھیں اللہ میاں کو تلاش کر رہی تھیں۔ان کا کہیں پتہ نہ تھا۔

دروازے کے باہر بالکل قریب جوتے اتار کر چھوڑے ہوئے تھے۔والد نے اپنی چپلیں اتار دی تھیں۔ میں کھڑا رہا۔میرے جوتے والد صاحب نے اتارے اور اپنی چپلوں کے ساتھ رکھ دئے۔ بالآخر ہم دونوں صحیح معنوں میں اللہ میاں کے گھر میں داخل ہو گئے۔ ننگے پاؤں—— اللہ میاں کو جوتے شاید اس لئے پسند نہ تھے کہ ان کے تلوں کے ساتھ مٹی اور گندگی ان کے گھر میں آ جاتی۔اللہ میاں کو گندگی پسند نہیں تھی—— وہ صفائی پسند تھے۔میری والدہ کی مانند—— دروازے کے پاس ایک بانس سے لپٹی ہوئی چنبیلی کے پھولوں کی بیل تھی۔ ہرے رنگ کی اس بیل پر سفید کلیاں لگی تھیں۔کھلی بھی، ادھ کھلی بھی اور بند بھی—— مجھے پھول بہت پیارے لگتے ہیں۔ ہر طرح کے پھول—— مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ اللہ میاں کو بھی پھول پسند ہیں۔''اللہ میاں کی اور میری پسند ایک سی ہے'' میرے بچہ ذہن نے سوچا۔

''تو کیا اللہ میاں، میرے جیسے ہیں۔۔۔؟'' میری سوچ ایک قدم آگے بڑھی ''نہیں۔۔۔ اللہ میاں میرے جیسے نہیں ہو سکتے۔ سب کہتے ہیں وہ بہت بڑے ہیں۔۔۔ تو پھر مجھ جیسے کس طرح ہو سکتے ہیں؟ میں تو ابھی ایک بچہ ہوں'' میں نے اپنی بچکانہ سوچ کی نفی کی اور ایک بار پھر اپنے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ اللہ میاں دکھائی نہیں دیئے۔ ایک جانب پانی کے دو مٹکے تھے۔ وضو کرنے کی جگہ تھی۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی وضو بنا رہا تھا۔ ایک بے حد موٹا آدمی تسبیح ہاتھ میں لٹکائے ٹہل رہا تھا۔۔۔ دو چار آدمی صحن سے اندرونِ مسجد جا رہے تھے۔ میں نے سوچا ''اللہ میاں اندر ہوں گے۔'' والد کے پیچھے پیچھے میں بھی اندر چلا گیا۔ اندر صفیں بچھی تھیں۔ دور ایک بڑی سی محراب تھی۔ اس کے قریب ایک چوبی ممبر تھا۔ محراب کے پاس سفید ململ کا کرتا اور آسمانی رنگ کی چارخانہ تہہ مد پہنے ہوئے ایک پھلپلے پھلپلے بدن کے گورے چٹے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ والد صاحب نے ان کو سلام عرض کیا اور مجھے ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ وہ اللہ میاں ہرگز نہ تھے، مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ اللہ میاں آدمیوں کے جیسے نہیں ہوتے۔

اور یہ تو آدمی تھے۔ لوگ ان کو بغدادی صاحب کے نام سے مخاطب کر رہے تھے۔ ٹوٹی فصیل، سلطان پورہ، نور خاں بازار میں واقع وہ مسجد بھی بغدادی صاحب کی مسجد کہلاتی تھی۔ بغدادی صاحب نے میرے سر اور کندھوں پر اپنے دونوں موٹے موٹے گوشت بھرے ہاتھ پھیرے۔ وہ ہاتھ بے حد نرم تھے۔ جیسے ربر کے بنے ہوں۔ بغدادی صاحب خود بھی ربر کے بنے ہوئے ایک بڑے سے گڈّے لگتے تھے۔ انہوں نے مجھے سامنے بٹھایا اور میرے چہرے اور سر پر کچھ پڑھ کر پھونکا۔ پاس رکھی ہوئی اک سفید رنگ کی طشتری میں کچھ کھجوریں تھیں۔ بغدادی صاحب نے اس طشتری سے ایک کھجور اٹھائی اپنا منہ تھوڑا سا کھولا اور نصف کے قریب کھجور اپنے دانتوں سے بڑی چترائی سے کتری اور باقی آدھی میرے منہ میں گھسیڑ دی۔ ان کے منہ کی کھجور کو میں اپنے منہ میں برداشت نہ کر سکا اور فوراً تھوک دیا۔

''کِند راتا ہے'' بغدادی صاحب کی زبان سے نکلا۔ میری اس حرکت سے والد صاحب کو ندامت ہوئی۔ انہوں نے میری دونوں بغلوں میں اپنے ہاتھ ڈال دیئے اور مجھ کو اٹھا کر باہر لے گئے کچھ دیر بعد اذان شروع ہوئی اور نمازی صف بستہ ہونے لگے کسی نمازی نے مجھے اپنے پہلو میں کھڑا کیا اور اس طرح میں نے اپنی زندگی کی پہلی با جماعت نماز ادا کی۔ وہ اس طرح کہ سب کو دیکھ کر اُن کی نقل میں، رکوع سجود، کرتا اور اٹھتا، بیٹھتا رہا۔ اس تجربے کے ساتھ مجھ پر یہ راز افشا ہو گیا کہ اللہ کے گھر میں۔۔۔ اللہ کے بندے اللہ کے سامنے پیش ہوتے ہیں لیکن اس گھر میں اللہ میاں نہیں ہوتے۔ مجھے بے حد مایوسی ہوئی تھی۔ یہ ایک طرح کی زیادتی تھی۔ صاف۔ صاف۔

ایک انجانے خوف کے باوجود جو میرے ننھے سے وجود کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھا، میں اللہ میاں کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ ابا جان مجھے اللہ میاں کے گھر لے جانے والے ہیں۔ میں بے حد خوش تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اللہ کے گھر میں اللہ میاں کو نہ پا کر۔ میں اتنا ہی اداس ہو گیا تھا۔ ایسے وقتوں میں میرا معمول تھا کہ میں خوب روتا اور بسورتا تھا۔ زمین پر ٹانگیں گِھس گِھس کر اپنی مطلوبہ چیز مانگتا۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی میں سیدھا دالان کے اس گوشے میں پہنچا جہاں بیٹھ کر یہ سب کچھ کرنے کا عادی تھا۔ میں وہاں بیٹھ تو گیا لیکن کوشش کے باوجود نہ تو اپنی مخصوص ''ریں، ریں'' شروع کر سکا اور نہ ہی ٹانگیں گھسنے میں کامیاب ہو سکا۔ میرے حلق سے ''ریں، ریں'' کی آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے سوچا ''یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔؟ میں اپنی

معمول کی ''ریں، ریں'' کرنے میں کیوں ناکام ہو رہا ہوں۔؟''

اچانک میں نے حیرانی سے یہ محسوس کیا کہ اندر ہی اندر مجھے کچھ ہو رہا ہے۔ میں کسی کو آواز دے رہا ہوں۔ میں بِلک بِلک کر پکار رہا ہوں۔ ''اللہ میاں! اللہ میاں!'' میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ روتے، روتے میں نے اسی طرح دالان کے فرش پر سر ٹکا دیا جیسے اللہ میاں کے گھر میں لوگ نماز کے دوران کر رہے تھے۔ سجدے کی حالت میں اللہ میاں کو پکارتے۔ بغیر آواز کے لیکن آنسوؤں سے روتے۔ میں جانے کب سو گیا یا غافل ہو گیا۔ مجھے یاد نہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ نہ ہی خواب میں اور نہ ہی میری غفلت کی حالت میں مجھے اللہ میاں دکھائی دیئے۔

کروڑوں برس پہلے جب پہلی مرتبہ آدمی نے اللہ کا گھر بنایا اور پھر بناتا ہی چلا گیا مَیں اپنے کسی بزرگ کی انگلی تھام کر اللہ میاں کے ہر نئے گھر میں برابر جا رہا ہوں اور اللہ کے گھر میں، اللہ کو نہ پا کر مایوس لوٹ رہا ہوں پھر کسی اور جگہ اور وقت، کسی اور اللہ کے گھر میں جانے کے لئے۔

......کفارہ......

برسوں باہر رہنے کے بعد میں حیدرآباد پہنچا تو اس کا بدلتا ہوا چہرہ یکسر بدل چکا تھا۔ مجھے صرف ایک ماہ کا ویزا ملا تھا اور فارن ایکسچینج کی مد میں بھی بہت تھوڑی رقم ملی تھی۔ ملنے ملانے اور دعوتیں اڑانے کے علاوہ مجھے ایک دو ضروری فرائض نمٹانے تھے۔ میں نے جلدی جلدی وہ سب کام انجام دے دئے جو میرے ذہن میں مرتب شدہ فہرست میں موجود تھے۔ جن مقامات کی سیر کرنی تھی وہ بھی کر لی۔ جب بھی احباب نے مجھے تنہا چھوڑا، اُن جگہوں کی زیارت بھی کر لی جہاں میں نے اپنی بھاگ متی کے ساتھ وقت گزرا تھا۔ ان سنسناتی سڑکوں پر اکیلا گھوما جن پر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، ہم لوگوں کی نظروں سے چھپ کر پہروں گھوما کرتے۔ جب ویزا کی مدت ختم ہونے لگی تو میں نے اپنے اس فریضے پر دھیان دیا جو میرے لاشعور میں جانے کب سے ایک خلش کی صورت میں موجود تھا۔

اس خلش کا تعلق میرے لڑکپن سے ہے۔ ان دنوں میں سلطان پورہ، حیدرآباد میں اپنے لوگوں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ اسکول کے بعد زیادہ وقت امین احمد کے ساتھ گزارتا۔ ان ہی دنوں امین احمد کے مہمان خانے میں مقیم الدین قیام پذیر ہوئے۔ وہ امین احمد کے والد حکیم انیس احمد کے نئے مددگار کے طور پر ملازم ہوئے تھے۔ مقیم الدین ہم دونوں سے بہت بڑے ہونے کے باوجود ہم میں گھل مل گئے تھے۔ آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی چمک تھی۔ ہمہ وقت مسکراتے، ہنستے اور دانت دکھاتے رہتے چہرہ پر بکرا داڑھی تھی۔ اچھل اچھل کر بولتے ہوئے عجیب احمق سے لگتے تھے اور شاید تھے بھی۔ ان کی باتوں کا دائرہ مذہب اور وہ بھی مذہب اسلام تک محدود تھا۔ ہر کسی کو عربی بولنے پر راغب کرتے رہتے۔ ہم ان کو ''یا اخی'' پکارتے انہی دنوں رمضان کا مہینہ شروع ہوا۔ میرا اور امین احمد کا پہلا رمضان تھا یعنی ہم زندگی میں پہلی مرتبہ روزے رکھ رہے تھے۔ ایک دن سحری کھانے کے بعد بجائے سونے کے میں گھر سے باہر نکل گیا۔ اتفاق سے امین احمد اور یا اخی بھی باہر مل گئے۔ ہم تینوں سحری کے وقت، ادائیگیٔ فجر کے بعد اکٹھے ہوئے تو ہم میں جوشِ ایمانی نے زور مارنا شروع کیا۔ اللہ اکبر، کے نعرے لگاتے ہوئے ہم وہاں سے خاصی دور ایک پہاڑی پر پہنچے اور اس کی چوٹی پر چڑھ کر اس طرح کا انداز اختیار کیا جیسے ہم مجاہدانِ اسلام ہیں جنھوں نے اس پہاڑی کو فتح کیا ہو مقیم الدین کا جوش و خروش دیوانگی کی حد کو چھو رہا تھا۔ وہ عربی زبان میں چیخ چیخ کر نعرے بلند کر رہے تھے ۔ وہ اچھلتے پھر رہے تھے۔ ان کی آنکھیں ابل پڑ رہی تھیں۔ وہ آسمان کی جانب دیکھتے جاتے اور عربی میں چلّا چلّا کر کچھ کہتے جاتے اور روتے بھی جاتے تھے۔ شروع شروع میں ہم ان کے ساتھ کھڑے 'اللہ اکبر' کے نعرے بلند کرتے رہے لیکن بعد میں احساس ہو گیا کہ ''یا اخی'' کچھ پٹری سے اترے ہوئے لگ رہے تھے۔ ہم نے ان کو بیٹھنے پر مجبور کیا۔ وہ بڑی مشکل سے قابو میں آئے۔ پہاڑی سے نیچے اتر کر ایک جگہ تینوں نے سرکاری نل پر ہاتھ منہ دھوئے۔ یا اخی کے اوسان درست ہو گئے۔ واپسی کے سفر میں ایک ویران سی جگہ جھاڑ جھنکار کے درمیان مجھے ایک ویران دیول (مندر) نظر آیا۔ میں نے کہا ''چلیں اس دیول کو اسلام کے نام پر فتح کرتے ہیں۔'' میرے اس خیال سے نہ تو امین

احمد نے اتفاق کیا اور نہ ہی یا اخی نے اُن کی دلیل یہ تھی کہ پرانے غیر آباد دیول میں جانا اس لئے ٹھیک نہیں کہ اس پر سانپ بچھو اور بھوت پریت قبضہ کر لیتے ہیں۔ ان دونوں کے منع کرنے کے باوجود میں نے 'اللہ اکبر' کا ایک نعرہ لگایا اور دیول فتح کرنے چلا گیا۔ وہ دونوں میرے ساتھ نہیں آئے۔ دیول کے اندر مٹی دھول، سوکھے پتے اس بات کا ثبوت دے رہے تھے کہ دیول کو بالکل ہی ترک کر دیا گیا تھا۔ سانپ بچھو کے خوف سے میں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر دھر رہا تھا۔ فرش تو فرش دیواروں پر بھی دھول جمی تھی۔ ایک دیوار پر سواستیکا کا بڑا نشان دھول میں اٹ کر مدھم پڑ چکا تھا اور دوسرے نقش نگار کا بھی وہی حال تھا۔ رام، لکشمن اور سیتا کھڑے تھے اور ایک کونے میں ہنومان جی گرز تھامے موجود تھے۔ مورتیاں محفوظ تھیں جس کا مطلب تھا کوئی اس دیول میں گاہے گاہے آتا اور تھوڑی بہت دیکھ بھال بھی کرتا ہوگا۔ یہ پکّی بات تھی کہ اس سے کوئی نہ تھا۔ میں نے اس دیول کے اندر چہار جانب دیکھا۔ وہ کیا جو سوچ رکھا تھا اور فتح کا نعرہ اللہ اکبر لگا تا ہوا باہر نکل گیا۔ باہر نکل کر میں نے امین احمد کے کان میں کچھ کہا۔ وہ ہنس پڑا۔ یا اخی چونکہ عمر میں ہم سے بڑے تھے اس سبب سے اس بات میں ان کو شریک کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ کچھ عرصہ تک جو کیا تھا وہ قابل فخر لگا، کچھ عرصہ بعد حماقت اور بعد میں ایک خلش کی مانند ذہن میں وقفے وقفے سے چبھنے لگا۔

آخر اس چبھن سے چھٹکارہ پانے کے لئے کیا کیا جا سکتا تھا۔؟ اس سوال کو میں نے اپنے شعور میں اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں اپنے کئے پر نادم تھا اور اس کا پراشچت بھی کرنا چاہتا تھا۔ یہی ایک فریضہ تھا جو باقی رہ گیا تھا۔ حیدر آباد چھوڑنے سے قبل اس فریضے کی ادائیگی لازم تھی۔ شاید یہ مسئلہ اب لاشعور سے شعور کی سطح پر آ گیا تھا۔ فرار کے سارے راستے بند ہو چکے تھے۔ اس رات میں سو نہ سکا۔ میں نے ایک طاقتور ٹارچ اپنے ایک دوست سے عاریتاً حاصل کر لی تھی۔ منھ اندھیرے، میں اس دیول کی جانب نکل گیا۔ باہر سے اچھی طرح آہٹ لے کر جب میں نے یہ یقین کر لیا کہ دیول میں کوئی موجود نہیں تھا تب میرے قدم اندر کی طرف گئے۔ دیول کی حالت ناگفتہ بہہ تھی۔ اندر سب کچھ ٹوٹا پھوٹا تھا البتہ مورتیاں صحیح سلامت کھڑی تھیں۔ شاید کوئی بھگت ماہ دو ماہ میں دیکھ جاتا تھا۔ میں جس انداز میں اپنا فریضہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ اس پر مزید غور کیا میرے اندر کوئی مجھ سے کہے جا رہا تھا۔

''تم نے جو کیا تھا وہ لڑکپن کی حماقت تھی۔۔ تم جو کرنے جا رہے ہو وہ تمہاری پختہ عمری کی حماقت ہوگی۔ اس متروکہ دیول میں کچھ بھی کرنا۔۔ بے ضرورت ہی تو ہوگا۔''

دیول سے باہر نکل کر میں قریبی بازار گیا۔ دوکانیں بند تھیں البتہ قریب ہی ایک گھاؤ خانہ (قہوہ خانہ) کھلا تھا۔ دستور کے مطابق قہوہ خانے فجر کے وقت کھل جاتے تھے۔ میں نے وہاں ایک کلچہ کھایا اور قہوہ پیا۔ اس دوران دوکانیں کھل گئیں۔ میں نے ایک دوکان سے جھاڑو، مگّا، اور ایک ڈول خریدا۔ اور پڑوس کی دوکان سے موٹے کھدّر کے دو بڑے بڑے رومال۔ اس سامان کو لے کر میں دیول کے اندر پہنچا۔ مجھے ڈر تھا کسی کے آجانے کا۔ وہ جو کبھی کبھار دیول کی تھوڑی بہت دیکھ بھال کر جاتا ہے۔ وہی نہ آجائے۔ میں نے انتہائی تیزی سے اپنا کام شروع کر دیا۔ پہلے جھاڑو لے کر چھت سے جہاں تک بن پڑا، مکڑی کے جالے اور دھول مٹی جھڑائی، پھر دیواروں کو جھاڑا، مورتیوں کو

جھاڑا، پھر فرش صاف کیا، کچرا ایک کونے میں جمع کر کے باہر پھینک آیا پھر کپڑے سے مورتیوں کی صفائی کی اور پانی سے بھی ان کی اچھی طرح دھلائی کی۔ اتنا کچھ کرنے کے دوران یہ احساس ہوتا رہا کہ میرے اندر بھی سب کچھ دُھل رہا ہے، صاف ہو رہا ہے برسوں پہلے کا گند۔ میں اندر سے صاف صاف اور ہلکا ہو کر دیول سے باہر آیا اور تیز تیز چلنے لگا لیکن جلد ہی ایک ہجوم نے مجھے گھیر لیا۔

''تو مسلمان ہے۔ مسلّا۔ تو دیول میں کیا کر رہا تھا۔''

''پاپی'' ۔۔۔۔۔۔۔۔ ''ملیچھ''

''آتنک وادی۔ دہشت گرد''

آوازوں نے مجھے چاروں جانب سے دبوچ لیا۔ میری آواز پر کان دھرنے والا کوئی نہ تھا۔ مجھ کو مارا پیٹا جا رہا تھا گھونسوں، لاتوں اور ٹھوکروں سے۔

''ٹھہر جاؤ۔ اس کو دیول کے اندر لے چلو۔ وہیں اس کی بلی چڑھائیں گے۔ سالا، حرامی۔'' ایک آدمی نے دبنگ آواز میں اعلان کیا۔ مجھے گھسیٹ کر دیول میں لیجایا گیا اچانک جو شور میرے ساتھ چل رہا تھا۔ ساکت ہو گیا جیسے وقت بھی گزرنا ترک کر کے ایک جگہ ٹھہر گیا۔

''یہ صاف صفائی تو نے کی۔؟'' اسی دبنگ آواز نے سوال کیا۔ میں ابھی تک اپنی سانس سنبھالنے میں لگا تھا۔ میں نے زندگی میں اس سے پہلے کبھی مار نہیں کھائی تھی۔

'' تو مسلمان ہے نا۔۔ پھر دیول کی صفائی اور دھلائی۔ یہ کیوں۔؟''

کوئی مجھ سے محبت بھرے لہجے میں مخاطب تھا۔ میرے کانوں میں اس کی آواز بہت دور سے آ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مجھے ہسپتال لیجانے کے انتظامات میں مصروف تھے اور میں نیم بے ہوش کسی کی گود میں پڑا تھا۔ مجھے مارنے والے مجھ پر وارے وارے جا رہے تھے۔

☆☆☆

......جہانِ دیگر کے راستے پر......

(**اور** جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں،تو انہوں نے کہا کہ ایسے شخص کو کیوں پیدا کرتا ہے جو زمین میں فساد کرے اور خون بہائے) (آیت 30،سورۃ البقرہ) قرآن حکیم۔

وقت شاید سست رفتار ہو گیا ہے۔ دن، رات گھسٹ گھسٹ کر گزر رہے ہیں۔ایسا شاید اس لئے محسوس ہو رہا ہے کہ موسم اذیت دہندگی پر اُتر آیا ہے۔پچھلے برس سب کچھ اس کے برعکس ہو رہا تھا۔ پچھلا برس تو بڑا تیز رفتار تھا۔اکتوبر تو یوں گزر ا جیسے جانتا ہی نہ ہو کہ موسم سرما کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ نومبر ایسا لگا جیسے گرم مما لک میں گلابی جاڑے لگتے ہیں۔شمالی امریکہ اور کنیڈا میں لوگ سفید کرسمس کو ترستے ہی رہ گئے۔ سردی ہوئی لیکن یونہی سی۔گرم کپڑے اچھی طرح لادنے بھی نہ پائے تھے کہ مارچ نے اپنی دستک دے دی۔اس سال تو جی بھر کے سردی پڑ رہی ہے اور برف تو جیسے ڈھیروں ڈھیر۔شکاگو میں یہ حال ہے کہ دن میں برف پگھل رہی ہے تو رات میں جم رہی ہے۔سفیدی (برف کی) آنکھوں سے ہو کر روح میں،یا شاید دل میں اترتی جاتی ہے اور پھر دل سے ہو کر خون کی نسوں میں سرایت کر کے،بدن کے مساموں سے باہر پھوٹ کر جلد کے اوپر ثانوی جلد کی مانند چڑھی جا رہی ہے۔ ہری بھری گھاس جو کبھی گھروں کے آگے پیچھے لان بناتی تھی۔ برف سے لڑتے لڑتے عاجز آ گئی ہے۔ادھر وہ برف کے سفید فرش کو پتی پتی ریزہ ریزہ کرتی ہے۔ادھر برف کی یورش تازہ اس کو سفید کفنی پہنا کر نئے سرے سے دفنا دیتی ہے۔میری عمر چھہتّر پلس ہو چکی ہے۔مجھ میں اتنے شدید اور اتنے طویل موسم سرما سے نبرد آزمائی کی تاب نہیں رہی۔سردی میرے بدن کے گوشت کو خاطر میں نہ لا کر،ہڈیوں کو اپنی آماجگاہ بنائے رکھتی ہے۔سارا دن،ساری رات،میرا جوڑ جوڑ درد کرتا ہے۔گھر کا مرکزی گرمانے والا نظام مستعدی سے اپنا کام کر رہا ہے۔

گھر میں ہم بوڑھے میاں بیوی کے علاوہ،دو بچے بھی ہیں۔ایک لڑکا بعمر ڈھائی برس اور ایک بچی جو ہنوز دو ماہ کی بھی نہیں ہوئی ہے۔بیٹا، بہو دونوں گھر کو ممکنہ حد تک گرم رکھنا چاہتے ہیں۔اگر ساس،سسر (ماں،باپ) کو یکبارگی فراموش بھی کر دیں تو دو ماہ سے کم عمر کی نئی مہمان بچی کو کس طرح نظر انداز کر سکتے ہیں؟اس وقت جب میں کاغذ اور قلم سے شغل کرنے میں مصروف ہوں،میری بیوی اور بہو قریبی بازار میں گرو سری کرنے گئی ہوئی ہیں۔ان کے ساتھ ڈھائی سالہ لڑکا بھی گیا ہے۔لڑکے کو لے جانا اس لئے بھی ناگزیر تھا کہ وہ بچی پر حملہ کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔بچی کو وہ میرے ساتھ چھوڑ گئی ہیں۔ بچی میرے ساتھ گھنٹے دو گھنٹے آرام سے رہ جاتی ہے۔میرے ہاتھوں کا لمس اسے پسند ہے اور شاید میری آواز بھی۔

جیسے ہی وہ میری آواز سنتی ہے تو رونا دھونا بند کر دیتی ہے۔میں اس کو لوری کے انداز میں 'اللہ ھو' کا جاپ سناتا ہوں۔اس کے ہاتھوں اور ٹانگوں کی بے چینی ختم ہو جاتی ہے۔آہستہ آہستہ اس کے اعضاء کا سارا اضطراب رفع ہو جاتا ہے۔وہ میرے چہرے اور اس کی اوپر نیچے

حرکت کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی ہے۔اس کی آنکھوں میں حیرانی صاف صاف دکھائی دیتی ہے۔نہ جانے کیوں اس کی ان حیران نظروں میں ایک طرح کی تضحیک بھی جھلک جھلک اٹھتی ہے۔جیسے وہ میری اوٹ پٹانگ حرکات کا مضحکہ اڑا رہی ہو۔جس کمرے میں اس قت میں اپنی پوتی کو کھِلا رہا ہوں یا سُلا رہا ہوں اور جو ہم بوڑھوں کا کمرہ ہے، خاصا بڑا مستطیل ہے۔اس کے مشرقی کونے میں چھوٹا سا کوٹھری نما کلوزیٹ ہے اور شمالی دیوار میں دو، ایک دوسرے سے لگی لگی کھڑکیاں ہیں۔ایک اور کھڑکی مغربی کونے کے قریب ہے۔تینوں کھڑکیوں میں وینے شین بلینڈس نصب ہیں اور ان پر کپڑے کے منقش پردے بھی آویزاں ہیں۔جب تنہائی میسر آتی ہے تو میں تینوں کھڑکیوں کے بلینڈس بند کر دیتا ہوں اور ان پر پردے بھی گرا دیتا ہوں۔کچھ عرصے سے میں نے کھڑکی سے باہر دیکھنا چھوڑ رکھا ہے۔مجھے بے حد خوف آتا ہے۔ جب بھی میں کھڑکی سے نیچے گلی میں دیکھتا ہوں۔مجھے کچھ کا کچھ دکھائی دینے لگتا ہے۔میرے حواس پراگندہ ہونے لگتے ہیں۔ابھی میری عمر اتنی بڑی نہیں ہوئی کہ میرے دماغ کے کچھ سیل اپنے فرائض منصبی ادا کرنا چھوڑ دیں۔چند ماہ قبل بھی ہم بڈھے بڑھیاں یہاں رہ کر گئے تھے۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں سارا سارا اتوار ان کھڑکیوں سے چپکا رہتا تھا۔گلی میں —— ہمارے گھر کے سامنے کے مکانوں کی پوری صف اور اس کے مکینوں سے تھوڑی بہت تاک جھانک والی آگاہی پیدا کر چکا تھا۔سامنے کے مکانوں میں داہنے جانب صرف دو مکان آباد تھے۔(یہ ایک نئی بستی ہے) لیکن ان کے مکینوں میں سے صرف تین لڑکے گاہے گاہے نظر آتے تھے۔عمریں ان کی نو سے گیارہ برس کے درمیان ہوں گی۔ایک گورا تھا جو کسی جرمن نسل کے انتہائی بدصورت ٹھگنے قد کے کتّے کو ٹہلانے کے لئے نکلتا تھا۔اس کے داہنے ہاتھ میں کتّے کی رسّی اور بائیں ہاتھ میں تھیلی ہوتی۔دوسرے مکان سے دو کالے لڑکے نکلتے تھے جو آپس میں چُہلیں کرتے اصل سڑک کی طرف نکل جاتے۔سامنے کے مکانوں سے ایک میں ایک بڑھیا اور ایک ادھیڑ عمر کی عورت رہتی تھی۔بوڑھی عورت کے بال، بوڑھوں والے سفید تھے اور ادھیڑ عمر کی عورت اپنے بالوں کو شاید بلونڈ رنگتی تھی۔ان خواتین کے ہاں مہمانوں کی آوک جاوک بہت تھی اور خاص بات یہ کہ زیادہ مہمان عورتیں اور مرد پیدل آتے جن کو باہر چبوترے پر ہی کرسیاں پیش کر دی جاتیں۔عین سامنے والے مکان میں ایک بھدّا، بھاری بھرکم کالا مرد چھریرے بدن کی گوری کے ساتھ رہتا تھا، لیکن دونوں کی گاڑیاں جدا تھیں۔کالا مرد بہت کم دکھائی دیتا۔وہ گیراج کے اندر ہی سے کار میں سوار نکل جاتا۔البتہ گوری حسینہ ہر اتوار تھوڑا بہت وقت گیراج میں صفائی، ستھرائی کرتی۔ایسے میں اس کی معمول سے لمبی ٹانگیں، حرکت کرتی ہوئی بھلی لگتیں۔جب وہ کوئی چیز ادھر سے اُدھر رکھنے کے لئے جھک کر اُٹھتی تو چُست بلاؤز میں اس کی پتلی کمر لچکتی ہوئی نظر آتی اور دونوں گول گول کولھے انتہائی دل ربایانہ انداز میں علیحدہ علیحدہ تھرکتے۔یوں تو تاک جھانک ہوتی ہی معیوب ہے، لیکن اس لڑکی کو چھُپ کر دیکھتے ہوئے اپنے آپ کو کچھ زیادہ ہی مجرم محسوس کرتا۔بائیں جانب والے مکانوں میں آدمیوں سے زیادہ گاڑیوں کی آمدورفت دکھائی دیتی۔کوئی دو سال قبل ان میں سے ایک مکان کو کچھ عرصہ غیر معمولی اہمیت حاصل رہی تھی۔جب وہاں رہائش پذیر مس کرسٹی کی موت واقع ہوئی تھی۔ رومانہ کرسٹی اس سوسائٹی کی ایک مقبول بیس، اکّیس سالہ بلونڈ تھی۔اس کی تدفین میں بہت سارے لوگ شریک ہوئے تھے۔ماتمی سروس میں بھی قریبی ،گرجا پورا بھر گیا تھا۔سروس کے بعد بھی قریب ایک ماہ تک گھر میں تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔بعد میں اس گھر کے مکین کہیں اور نقل مکانی کر کے چلے گئے۔

رومانہ عراق میں کسی ٹی وی چینل کی طرف سے کوریج کرتے ہوئے ماری گئی تھی۔ میرے بیٹے کو سوسائٹی کے 'جیم' سے اس کی موت کی جو تفاصیل ملی تھیں، وہ بھی متضاد تھیں۔ کسی نے کہا ''رومانہ کرسٹی عراق کے شہر موصل میں کسی خود کُش حملے کا شکار ہوئی'' جب کہ دوسری نوعیت کی خبریں یہ تھیں کہ وہ بغداد کے کسی نواحی گاؤں میں غلطی سے کیئے ہوئے امریکی ہوائی حملے کی زد میں آ گئی تھی۔ رومانہ اگرچہ میڈیا سے متعلق تھی، لیکن اس کی جواں مرگی صرف چند روز میڈیا کا موضوع بنی رہی۔

باہر جانے سے قبل میری بیوی نے ایک کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا تھا۔ اس کھڑکی کے بلائنڈس بھی وا کر دئے تھے۔ ساتھ ہی مجھے سخت، سست کہا تھا۔ اس کا بس چلے تو تینوں کھڑکیوں کو بالکل ننگا کر دے۔ یوں بھی اس کو گرمی زیادہ لگتی ہے اور سردی کم۔ ان زبردست برفانی جاڑوں میں بھی وہ اپنے دونوں پیر کم فرٹر (لحاف) سے باہر نکال کر سوتی ہے اور میرے اصرار پر بڑی بے دلی سے ہلکا پھلکا سوئیٹر پہنتی ہے۔ جب کہ میرا یہ حال ہے کہ گھر میں مرکزی حرارتی نظام کے باوجود شب و روز دو، دو سوئیٹر چڑھائے رکھتا ہوں۔ اندر بغیر آستینوں کا اور باہر پورے آستینوں کا پُل اوور — سوتے سمے میں سارا کا سارا کم فرٹر کے اندر سما جاتا ہوں۔

بچی مجھ کو حیرانی یا تضحیک سے دیکھتے ہوئے بالآخر اپنے بوجھل ہوتے ہوئے پپوٹوں کو بند کر لینے پر مجبور ہو گئی۔ اعضاء کی حرکات تو پہلے ہی تھم چکی تھیں۔ جماہیاں بھی جلد ہی رُک گئیں۔ میں نے اپنی ''اللہ ہو'' کا جاپ بند کر کے دیکھا کہ میری خاموشی کا اس پر کیا اثر ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ذرا سا کلبلائی۔ میں نے جاپ کی جگہ صرف ''ہوں ہوں'' وہ بھی ہلکے سروں میں شروع کر دی۔ چند ایک سیکنڈ اس طرح گزرے ہوں گے کہ وہ نیند کی آغوش میں پوری طرح سما گئی۔ اس کا ننھا سا وجود ایک چھوٹے سے لفافہ نما گلابی رنگ کے گدّے میں چھپا ہوا تھا جب کہ ننھا منّا چہرہ اور دو چھوٹے چھوٹے گورے ہاتھ اس گدّے سے باہر تھے۔ سر پر اونی لال رنگ کی پھندنے والی ٹوپی منڈھی تھی۔ اس ٹوپی کے کنارے پر چھوٹے چھوٹے سیاہ پھول کڑھے تھے۔ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے اس ٹوپی کو بچی کے ماتھے سے قدرے اوپر کِھسکا یا تھا کیونکہ ٹوپی نے بچی کی ایک آنکھ کو آدھا ڈھانک لیا تھا۔ ٹوپی کو اوپر کھسکانے سے اس کے سر کا کچھ حصہ باہر نکل آیا تھا اور سیاہ بال ماتھے کی سفید گلابی رنگت کو نمایاں کر رہے تھے۔ بچی کا ماتھا چوڑا اور روشن تھا۔ سوتے میں وہ گلاب کی پتیوں سے بنا ایک ننھا سا حسین وجود دکھائی دے رہی تھی۔ بھویں بالکل ہلکی تھیں، غیر محسوس حد تک۔ البتہ آنکھیں بند ہونے کے باوجود غضب ڈھا رہی تھیں۔ گلابی پپوٹے ڈھکے ہوئے جیسے ادھ کھلے ننھے منّے گلاب کی پنکھڑیاں، پلکیں کسی ماہر مصور کے باریک موئے قلم سے کھینچے ہوئے نیم دائرے، ناک نازک لیکن نیم بیضوی چہرے پر اونچی کھڑی ہوئی، ناک کی جڑ اَبروؤں کی کمانوں کے دونوں اندرونی سروں کے درمیان ننھی منی دو گرہیں تشکیل دے رہی تھیں۔ صاف لگتا تھا کہ بچی نے خود اَبروؤں میں بل ڈالے ہوں۔ جیسے اس کو آج کی دنیا میں آنا ناگوار گزرا ہو یا زمان و مکان کا وہ مرحلہ جو اسے مقدر کیا گیا ہے، پسند نہ آیا ہو۔ گلابی گال نہ زیادہ اُبھرے گل گلوں جیسے نہ ہی سیدھے سپاٹ، دہانہ چھوٹا۔ لب بھی نازک لیکن ابھرے ابھرے سے۔ میں جب بھی اس کو دیکھتا وہ میری آنکھوں سے روح کے اندر اتر آتی۔ سوتے میں، اس کو دیکھنا تو غضب ہو جاتا۔ میرا جی چاہتا کہ اس پر فدا ہو جاؤں۔ اپنا آپ اس پر نچھاور کر دوں۔

بڑی دیر میں بچی کو دیکھتا رہا — اس کی سرخ ٹوپی نے اس کے دونوں گلابی کانوں کو اس وقت بھی نصف ڈھانکا ہوا تھا۔ بیضوی چہرے پر

چھوٹی سی تھوڑی کہیں غائب ہوچکی تھی۔ یہی حال گردن کا تھا۔ وہ بھی کہیں گم ہوگئی تھی۔ میں اس کوئیوں خوابیدہ معصومیت میں ڈوبا، دیکھتا رہا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ بچی بے خبر سو چکی ہے۔ نہایت دھیرج سے میں نے اپنے جسم کو اس پلنگ سے جُدا کیا جس پر بچی سوئی ہوئی تھی اور بلا ارادہ کھڑکی تک آ گیا۔ باہر کا منظر معمول کا تھا۔ دو رویا برف پوش مکانوں کے درمیان دونوں جانب سفید برفیلے پیڈیسٹرین پاتھ اور ان کے بیچوں بیچ لیٹی ہوئی سیاہ تارکولی سڑک، برف کی دودھیلی تہہ سے اٹی۔ ابھی اس معمول کے منظر پر نظر کچھ ٹھہری ہوگی کہ ایک جھماکہ سا ہوا اور سامنے شکاگو کا ایک مشہور بازار اور اس بازار میں پانچ عورتوں (لڑکیوں) پر ٹارگٹ شوٹنگ—— میں نے اپنی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ لئے اور پیچھے ہٹ گیا۔ ''یہ مجھے کیا ہونے لگا ہے؟'' میں نے سوچا۔

''یہ منظر تو میں نے کسی ٹی وی چینل کے اسکرین پر بھی نہیں دیکھا تھا۔ بیٹے کی زبانی سُنا تھا۔ کھڑکی سے باہر—— گلی میں اس کا کیا جواز؟''

میں نے اپنے آپ سے یا اپنے اندر موجود کسی وجود سے یہ سوال کیا۔ میرے اس سوال کا جواب اندر ہی اندر مجھ کو ملا بھی ہو تو مجھے اس کا پتہ نہ چل سکا۔ میں نے اپنی آنکھوں پر رکھے ہوئے ہاتھ ہٹائے اور دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیوں سے اپنی دونوں آنکھیں مَلیں۔ دو تین مرتبہ اپنی آنکھیں بند کیں اور کھولیں۔ پہلے آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا، پھر کمرے کی ایک ایک چیز صاف دکھائی دینے لگی۔ کمرے کی مغربی دیوار پر لگی ہوئی گول کلاک پر بنے ہوئے ہندسے اور چھوٹی بڑی سوئیاں بھی واضح طور سے نظر آنے لگیں۔ ''آدمی کے ازلی اور ابدی دشمن'' میں شاید بڑبڑانے بھی لگا تھا یا بلند آواز میں سوچ رہا تھا۔ بڑبڑانے کے ساتھ ایک بار پھر میں آگے بڑھا اور کھڑکی سے باہر گلی میں جھانکا۔ نیچے گلی غائب تھی۔ کسی ٹورنیڈو کی لائی ہوئی ٹوٹ پھوٹ اور تباہی کا منظر تھا۔

اس مرتبہ میں نے آنکھیں ڈھانپ لیں، لیکن پیچھے نہیں ہٹا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹائے۔ میری آنکھوں کے آگے بالکل ہی مختلف منظر تھا۔ افریقہ کا کوئی شہر جہاں دو حریف قبائلی فرقوں کے مابین خونی جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ لوگ، عورتیں، بچے اور بوڑھے بھی مر رہے تھے۔ ہتھیاروں سے، اور فاقوں سے—— یہ سب مجھ سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور کھڑکی سے الگ ہٹ گیا۔ ''یہ کیا؟'' کوئی میرے اندر مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ ہو یہ رہا تھا کہ اب بند آنکھوں کے اندر ایک سے ایک بھیانک مناظر متواتر فلیش ہو رہے تھے۔ غازہ کی پٹی پر اسرائیلی جہاز اور ہیلی کوپٹر بم گرا رہے تھے، عراق، افغانستان اور میرے اپنے ملک میں خود کُش حملے ہو رہے تھے۔ آدمی گاجر، مولی کی طرح کٹ کٹ کر بکھر رہے تھے۔ ہوائی حملوں سے بستیاں کھنڈر ہو رہی تھیں۔ برباد ہو رہی تھیں—— جل رہی تھیں۔ معصوم مرد، عورت، بوڑھے، بچے جن کا کسی نزاع سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ناگہانی موت، اذیت اور بربادی کا شکار ہو رہے تھے۔ ترکوں نے کُردوں کے خلاف مورچے کھول رکھے تھے۔ افغانستان میں طالبان جانیں دے رہے تھے، جانیں لے رہے تھے۔ مرے اپنے وطن میں فوج اور بقولِ حکومتی ترجمان شر پسندوں کے مابین خودکار ہتھیارں سے خوں ریز جھڑپیں جاری تھیں۔ کراچی میں ایک مرتبہ پھر لوٹ مار مچی تھی۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے——؟ میری آنکھیں—— میری آنکھوں کو ان خونی مناظر نے کیوں گھیر رکھا ہے——؟''

میں سوال پر سوال کئے جا رہا تھا—— بار بار آنکھیں کھول، بند کر رہا تھا۔ آنکھیں مَسل رہا تھا۔ مجھے کچھ بھی صاف نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے اپنے اوسان جمع اور بحال کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش کے دوران ایک ایک قدم سنبھال کر رکھتے ہوئے پلنگ کی طرف بڑھا اور جیسے ہی پلنگ میری پہنچ میں آیا، میں نے اپنے بدن کو اس پر گرا دیا۔ پلنگ پر لیٹے، لیٹے میں نے بچی کے وجود کو محسوس کیا۔ وہ میرے قریب ہی لیٹی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بچی پر ایک نظر ڈالی— کچھ دیر اور میری نظروں پر وحشتوں کا تسلط رہا۔ سوتی ہوئی بچی بھی دکھائی نہیں دی، لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ، دھیرے دھیرے گلاب کی پتیوں سے تشکیل پایا ہوا وہ ننھا سا وجود نظروں کے سامنے اُبھرتا گیا۔ بچی گہری نیند میں تھی، لیکن اس کی تیوری میں ہنوز اسی طرح کے دو نازک بل پڑے ہوئے تھے جو میں نے پہلے مشاہدہ کئے تھے۔ میں نے اس کو بغور دیکھا۔ وہ سوتے میں مجھ سے مخاطب تھی۔ خاموشی جب بولتی ہے تو بہت بولتی ہے۔ گل (بچی کا نام گل ناز تھا) مجھ سے بولتی ہی چلی گئی۔ وہ ابھی تک اپنی دنیا سے قریب تھی۔ اس دنیا سے قریب جو مجھ سے بہت دور ہو چکی تھی— بہت دور— چھتّر برس سے بھی زیادہ دور— میں اس کی دنیا کی باتیں سن رہا تھا۔ ایک عالم محویت میں— ایک عالمِ خود فراموشی میں— حرف وصوت کے بغیر اس کی باتوں کا دائرہ پھیلتا چلا گیا۔ بہت ہی جلد اس دائرے نے کائنات اور ماورائے کائنات کا سب کچھ اپنے اندر سمیٹ لیا۔ میں چپکے سے اٹھا۔ مبادا گل سوتے سے اٹھ جائے۔ مبادا خاموشی کے ٹوٹتے ہی اس کی باتوں کا سلسلہ بھی ٹوٹ جائے اور جس دائرے نے کائنات اور ماورائے کائنات کی مسافتوں کو طے کر کے لحہ بہ لحہ خالقِ کائنات کے قریب تر ہونا شرع کر دیا ہے۔ یکبارگی سکڑنے لگے— سکڑتے سکڑتے ایک مرتبہ پھر بچی کے ننھے سے گلابی رنگ کے نیم بیضوی چہرے پر بنے ہوئے چھوٹے سے غنچہ دہن میں سما جائے۔ دبے قدموں ایک جانب چل کر کرسی کھینچی اور میز پر رکھے ہوئے کاغذ پر قدرے جھک کر بیٹھ گیا۔ دائیں ہاتھ میں قلم لے کر لکھنے کی کوشش کی۔ میں نے محسوس کیا کوئی غیبی طاقت مجھ کو وہ سب لکھنے سے روک رہی ہے جو میں نے بچی کی خاموشی کی زبان سے سنا تھا اور سن رہا تھا— میں نے قلم پھینکا، کرسی سے اٹھا، گدّے میں ملفوف بچی کو گدّے سمیت کندھے سے لگا لیا۔ جما جما کر قدم رکھتے ہوئے زینہ طے کیا۔ نیچے اترتے ہی بغیر اسنو شوز اور جیکٹ پہنے بیرونی دروازہ کھول کر برف اور برفانی ہواؤں سے معمور فضاؤں میں نکل گیا۔ مجھے بہر حال بچی کو بچانا تھا، اس دنیا سے جو بچی کے لائق نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جس طاقت نے میرے قلم کو روکا، وہی میرے قدم اس رستے پر لگا دے گی جس کو بچی کی 'خاموش کلامی' نے مجھ پر منکشف کیا تھا۔

☆☆☆

......چھت سے گرنے والی......

آندھی چلی تھی، تیز، بہت تیز— ہوا کے بدن میں بھوت اتر کر لڑ رہے تھے۔ ہلکے ہلکے جھونکے، جھکڑوں میں بدل کر، چنگھاڑ چنگھاڑ کر، ایک دوسرے پر وار کرتے، آپس میں گتھم گتھا ہوتے— اڑ رہے تھے۔ اڑنے کے دوران ہر اس چھوٹی بڑی چیز کو اڑا رہے تھے، جو ان کی زد میں آتی۔ پیڑ، پکھیرو، جھوپڑ، چھپر، چھت، ستون، کھمبے اور آدم زادوں کا پھیلا ہوا کاٹھ کباڑ— جس سے میں نے اس کو بلندی سے نیچے گرتے دیکھا، آندھی تھم کر غبار کی صورت فضا میں آویزاں ہوگئی تھی۔ سیاہ و سپید دھند کا آمیزہ سا جو دکھا تا کم اور چھپا تا زیادہ یا— نیم خواب نیم بیداری کی ملی جلی کیفیت۔ ایسی کیفیت جس کا رشتہ اس ماحول سے، اس فضا سے یا خود میرے اندرون سے تھا۔ اصل معاملہ یا مسئلہ یہی تھا کہ سب کچھ غیر واضح تھا۔ اگر کچھ صاف اور واضح تھا تو اس کا گرنا تھا۔ عمارت کی وہ چھت جس پر چلتے ہوئے، کافی بلندی سے وہ نیچے گری تھی، ابھی نیم تعمیر حالت میں تھی۔ پہلا سوال تو یہ پیدا ہو رہا تھا کہ شام کے جھٹ پٹے میں وہ ہسپتال کی چھت پر کیا کر رہی تھی؟ یہی سوال میرے اپنے بارے میں پیدا ہوسکتا تھا کہ میں وہاں اس سمے کیوں موجود تھا؟ یہ دونوں سوال بعد کی پیداوار تھے، جو وقوع پذیر ہو رہا تھا، وہ یہ تھا کہ میں دوڑ رہا تھا، اس چھت پر جو پوری طرح بنی بھی نہیں تھی۔ اس پر دوڑنا تو رہا ایک طرف چلنا بھی آسان نہیں تھا لیکن میں چھلانگیں لگا تا اور ہر رکاوٹ کو پھلانگتا ہوا اس نیم پختہ زینے کی جانب جلد سے جلد پہنچنا چاہ رہا تھا جو مجھے نچلی منزلوں تک لے جاسکتا تھا، تا کہ اس تک پہنچ سکوں۔ وہ جو میری نظروں کے سامنے چوتھی منزل کی چھت سے نیچے گر پڑی تھی، اگر چہ میں جانتا تھا کہ جب تک میں نیچے پہنچوں بہت تاخیر ہوچکی ہوگی۔ پھر بھی میں یہ چاہتا تھا کہ زینہ جلد آجائے، لیکن زینے پر قدم رکھتے ہی مجھے احساس ہوگیا کہ میں غلط زینے پر تھا۔ یہ وہ زینہ نہیں جس پر چڑھ کر میں ہسپتال کی چھت پر آیا، اپنے یار انجینئر راجا اکرم سے ملاقات کرنے، جس کے بارے میں نیچے اطلاع ملی تھی کہ وہ چھت پر ہوسکتا تھا۔ جیسے ہی میں زینے سے راہداری میں پہنچا، مجھے معلوم ہوگیا کہ میں ہسپتال کی عمارت کی پشت پر نرسوں کی اپارٹمنٹ کی عمارت میں اتر پڑا تھا۔ دوڑتا ہوا جب میں ایلیویٹر کی جانب گیا تو دو نرسیں چیختی چلاتیں میرے پیچھے دوڑیں۔ پتہ نہیں کیوں وہ فوراً ہی رک بھی گئیں؟ میں آرام سے ایلیویٹر کے ذریعے نیچے اتر گیا۔ نیچے انتہائی ناسازگار حالت کا سامنا تھا۔ شور ہی شور تھا۔ راستے پر ایک ٹریکٹر کھڑا تھا جو رکا ہونے کے باوجود شور کر رہا تھا۔ کسی اللہ کے بندے کے ذہن میں یہ خیال نہیں آرہا تھا کہ اس کو بند کردے۔ قدرے فاصلے پر فولادی سریوں سے لدا ہوا ایک ٹرک کھڑا تھا، جس کے باہر دو آدمی کسی معاملے پر بلند آواز میں بحث کر رہے تھے۔ ان دونوں سے قطع نظر کر کے میں اس نرس کی جانب گیا جو شاید ہسپتال کے شعبہ حادثات سے آرہی تھی۔

''اس کا کیا ہوا جو چھت سے گری تھی''، میں نے رسمی ہائے ہیلو سے درگزر کرتے ہوئے نرس سے دریافت کیا۔ نرس نے مجھے اس طرح

دیکھا جیسے وہ میرے سوال کو سمجھنے سے قاصر ہو۔ ''چھت سے گری تھی۔ کس چھت سے گری تھی؟'' اس سے پہلے کہ نرس کا سوال مجھ سے جواب کا طالب ہو، میں آگے دوڑ گیا۔ شعبہ حادثات کی کھڑکی پر ایک جوان نرس فون پر بات کر رہی تھی۔ دوسری سے جو قدرے بوڑھی تھی، میں نے چھت سے گرنے والی کی بابت دریافت کیا۔ وہ بھی ایسی بن گئی جیسے اس پورے واقعے سے لاعلم ہو۔

''لیز ذرا سنو، یہ صاحب کیا پوچھ رہے ہیں؟'' بوڑھی نرس نے جوان نرس کو مخاطب کیا۔ ''کیا پوچھ رہے ہیں؟'' جوان نرس نے سوال دہرایا۔ ''یہ کسی کو پوچھ رہے ہیں جس کو انہوں نے ہسپتال کی چھت سے نیچے گرتے دیکھا تھا؟'' بوڑھی نرس نے میرے سوال کو طنزیہ انداز میں نشر کیا۔ ''ہسپتال کی چھت سے تو کوئی نیچے نہیں گرا۔'' اچانک نہ جانے کس کونے سے ایک وارڈ بوائے نمودار ہوا اور بولا۔ میں جو غم زدہ تھا، اس کے لئے ذہنی اور دلی کرب میں مبتلا تھا، اس وارڈ بوائے پر پھٹ پڑا۔ اگر کاؤنٹر کیبن کی نیم دیواری درمیان میں حائل نہ ہوتی تو میں اس وارڈ بوائے کا منھ نوچ لیتا۔

''ظالمو! بے دردو! تم سب نے اس معاملے کو دبانے کی سازش کر رکھی ہے۔ مجھے سچ بتا دو۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ ہسپتال کو بدنام نہ ہونے دوں گا۔ جاؤ اپنے ایڈمنسٹریٹر سے بولو، ایک بندہ ہے جو ہر طرح کے فارم پر دستخط کرنے کے لئے تیار ہے۔ میں یہ بیان دینے پر بھی راضی ہوں کہ وہ چھت سے نہیں گری تھی بلکہ میں اسے سڑک سے اٹھا لایا تھا۔ میں سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اس کے لئے۔ اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔ مجھے اس کے پاس جانے دو۔ مجھے بتاؤ تم لوگوں نے اسے کہاں چھپا رکھا ہے۔'' میں نہ جانے کب تک اور کیا کیا بکے جاتا، اچانک میری نظریں اس وارڈ بوائے پر پڑیں جو میرے سامنے ہاتھ ملتا کھڑا تھا۔ دونوں نرسیں بھی اس کے پاس کھڑی میری جانب ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھیں جیسے میری حالت پر ترس کھا رہی ہوں۔ اس تمام دوران میں شاید روتا بھی رہا تھا اور اسی سبب سے ماحول سے بالکل بے خبر ہو گیا تھا۔ ہسپتال کی اس راہداری میں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ میں ان کی جانب پلٹا اور گریہ کرتے ہوئے ان سے گرنے والی کے بارے میں پوچھا۔ ان لوگوں نے بھی مجھ پر ترس کھانے والی نظریں ڈالیں اور وہاں سے کھسک گئے۔ ہسپتال کی راہداری میں آگے جانا بے کار تھا۔ میں نے نیچے اتر کر ہسپتال کے صحن میں دوڑ لگا دی۔ چشم زدن میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں اس کے گرنے کا سب سے زیادہ امکان تھا۔ میرے حساب سے اس کو عمارت کے قریبی لان میں کسی جگہ گرنا تھا۔ یا اس چھوٹے سے کیبن کی چھت پر جو دیوار کے ساتھ تھا اور جس میں مالی اپنا سامان رکھتا تھا۔ یا پھر ان چار جڑواں گیراجوں میں سے کسی ایک کی چھت پر جو ہسپتال کے چار بڑوں کی گاڑیوں کے لئے مختص تھے میں اس اسپتال کے پورے جغرافیے سے واقف تھا۔ اسی سبب سے اس تمام نواح میں پوچھ گچھ کر کے اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ معاملہ اتنا آسان نہیں رہا تھا۔ کہیں نہ کہیں کچھ غلط تھا یا غلط کیا جا رہا تھا۔ ہسپتال والے ضرور کچھ چھپا رہے تھے۔ اس کو گرتے ہوئے بہت کم آدمیوں نے دیکھا ہوگا اور ان کم آدمیوں میں سے مجھے کسی ایسے آدمی کی تلاش تھی جو زبان کھولے اور وقوعے پر روشنی ڈالے۔ یوں بھی بڑی تاخیر ہو چکی تھی۔ میں نے یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنے حواس پر پوری طرح قابو رکھوں گا۔ (اگرچہ میرے اندر کوئی روئے جا رہا تھا) مجھے جذباتی اور بدحواس دیکھ کر مصلحت پسندی کے مارے لوگ ترس کھا سکتے تھے، لیکن زبان نہیں کھول سکتے تھے۔ اس معاملے میں بیشتر عوامل میرے اور اس چھت سے گرنے والی کے خلاف جاتے تھے اور جیسے جیسے سمے گزرتا جاتا تھا، رات بھی آتی جاتی تھی۔ جس وقت وہ گری تھی یا

میری آنکھوں نے اس کو ہسپتال کی چھت سے نیچے گرتے دیکھا تھا، شام پڑ رہی تھی، لیکن اب تو رات تھی۔ رات میں ادھر ادھر پھرنا، خواہ ہسپتال میں، ایسا فعل ہے جو ہسپتال کے نگراں عملے کی نظروں میں آ سکتا تھا۔ میں ہسپتال کی اس پوری عمارتی اکائی (Unit) کے اطراف اچھی طرح دیکھ بھال کرتے ہوئے چکر لگا چکا تھا جس کی چھت سے وہ گری تھی۔ وہ یا اس کے بدن کا نام و نشان بھی نہیں ملا۔ دل گریاں کے ساتھ میں ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس بینچ پر پہلے سے کوئی پراگندہ لباس، پراگندہ حال بوڑھا آدمی بیٹھا تھا۔ اس کی بھویں چوڑی، کمانی دار اور سپید تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے آنکھوں کی کھڑکیوں کے اوپر دو سپید چھجے بنے ہوں، میں نے اس کو بس اتنا ہی دیکھا تھا کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا پارکنگ کی جانب چلا گیا۔ چلتے چلتے اس نے میری طرف دیکھے بنا مجھ سے کہا۔ ''قبرستان — ہسپتال کا قبرستان'' اس کے جاتے ہی، پارکنگ کے عقب سے اذان کی آواز میرے کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس سے قبل شاید اس لئے سنائی نہیں دی کہ میں ایک ہی خیال میں گم رہا تھا۔ ''حیّی علی الصلوٰۃ — حیّی علی الصلوٰۃ'' نماز کی طرف آؤ۔ نماز کی طرف آؤ۔ ''حیّی علی الفلاح —'' حیّی علی الفلاح'' فلاح کی طرف آؤ۔ فلاح کی طرف آؤ۔ میں بینچ سے اٹھا اور ہسپتال کی مسجد کی طرف روانہ ہو گیا یا اس کی جانب جس کی جانب ہر مشکل میں سارے آدم زاد رجوع ہوتے ہیں، یہ میں نہیں بتا سکتا۔ وضو بنا کر نماز میں شریک ہوا اور نماز کے بعد مسجد میں پوچھ گچھ کی۔ نمازیوں میں زیادہ تعداد ان کی تھی جو بیمار تھے یا بیماروں کے رشتے دار اور احباب تھے، میں نے ہر چہرے کو دعا کرتا ہوا پایا۔ ہسپتال آدمی کو جتنا خدا کے قریب کر دیتا ہے کوئی عبادت گاہ شاید ہی اتنا قریب کرے۔ چھت سے گرنے والی کے بارے میں پوچھ گچھ بیکار گئی۔ نمازی بھی جلدی میں تھے، مسجد سے نکل کر میں نے سوچا ''اب ایک ہی راستہ تھا اور وہ راستہ راجا اکرم کی طرف جاتا تھا۔ ایک مرتبہ پھر اس سے ملنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ شاید وہی میری مدد کرے۔''

مسجد سے باہر آ کر ایک بار پھر اس علاقے میں پہنچا جہاں ٹرک وغیرہ کھڑے تھے۔ فولادی سریوں والا ٹرک غائب تھا، لیکن ان دو آدمیوں میں سے جو کسی بات پر تکرار کرتے ملے تھے، ایک جو قدرے موٹا، پستہ قد، جو اپنی خشخشی موچھ اور داڑھی میں خاصا اہم اور معتبر لگتا تھا — موجود تھا، ٹریکٹر جہاں کھڑا تھا، وہیں ڈٹا ہوا تھا لیکن کسی نے اس کو بند کر دیا تھا، اس سبب سے خاموش تھا۔ میں نے اس الفربہ خواہ مخواہ معتبر سے بعد سلام راجا اکرم کے بارے میں دریافت کیا۔ راجا اکرم کا نام سنتے ہی وہ کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''آپ نے ان سے ملنا ہے تو جھٹ پارکنگ کی طرف دوڑ جائیے۔ وہ ابھی ابھی ادھر گئے ہیں۔''

ابھی اس کا فقرہ مکمل بھی نہ ہوا ہوگا، میں دوڑ پڑا۔ راجا اکرم پارکنگ کے راستے ہی میں مل گیا۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے، جو ٹیکنیشین لگتے تھے۔ مجھ سے رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا ''میں گھر جا رہا تھا — چلو کسی قریبی ریسٹوراں چلتے ہیں۔''

''مجھے تم سے کچھ کام ہے۔ ہسپتال کے اندر ہی بات کر لیں گے۔'' میں نے جواب دیا۔ راجا نے میری جانب غور سے دیکھا۔ یہ انجینئر قسم کے لوگ آدمی کو پڑھ لیتے ہیں۔ امپرسنل جو ہوئے، ایک ہلکے سے اشارے سے راجا نے ان دونوں بندوں سے چھٹکارا پا لیا۔ وہ سلام کر کے رخصت ہوئے پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''تیری تو بُری حالت ہے۔ کیا ہسپتال میں کوئی سیریس ہے؟''

''راجا میں تو اس مطلب سے آیا تھا کہ تجھے جلد سے جلد وہ چیز پیش کروں جو خاص تیرے لئے منگوائی ہے۔''

وہ آ گئی۔مزہ آ گیا۔اس خانہ ساز میں جو بات ہے وہ باہر کی مہنگی سے مہنگی شراب میں نہیں،لیکن یہ تیرے چہرے کو کیا ہو گیا ہے؟ پورے بارہ بج رہے ہیں۔'' راجا کو تیز کلامی کی عادت تھی وہ لمبی سے لمبی بات ایک سانس میں کہہ دیتا تھا۔

''تیری چیز آ گئی اور—اور میری چیز چلی گئی۔'' میں نے گریہ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ یہ میرے روتے بسورتے چہرے نے اسے بتا دیا ہوگا کہ میں کسی بڑے دُکھ میں مبتلا ہوں۔اس کا چربی چڑھا طبّاخی چہرہ ایک دم لٹک سا گیا۔وہ میرا قریبی دوست تھا۔ہم برسوں سے ایک دوسرے کے سکھ دُکھ بانٹ رہے تھے اور آپس میں بے تکلف بھی تھے۔''تو پتا بھی نہیں—تو پھر یہ تیری چیز چلی گئی—صاف بتا دے مرے بھائی۔بات کیا ہے؟'' وہ اپنائیت سے بولا۔

''وہ جو ہسپتال کی چھت سے نیچے گری ہے'' میں نے اس طرح کہا کہ میرے الفاظ ٹوٹ پھوٹ رہے تھے۔''

''اس ہسپتال کی چھت سے آج تک کوئی نہیں گرا۔راجا نے اپنی بھویں اوپر اٹھا کر اور آنکھوں کو پوری طرح کھول کر اعتماد کے لہجے میں کہا۔''راجا— تمھیں کیسے یقین دلاؤں۔آج ہی،آج کی شام جب میں تمہاری تلاش میں اور پر نیم تعمیر چھت پر پہنچا۔تم تو نہیں ملے،لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے—اس کو چھت سے نیچے گرتے دیکھا۔نیچے دوڑا آیا ہر طرف دیکھا،پوچھ گچھ بھی کی—اب تم سے مدد چاہتا ہوں۔''

''کیسی مدد۔؟'' راجا مجسم سوال ہو گیا۔اس کے لہجے میں اخلاص تھا۔''راجا۔مجھے یقین ہے کہ ہسپتال کی بدنامی کے خوف سے اس پورے واقعہ کو دبایا جا رہا ہے۔میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کرو اور اس گرنے والی کا پتہ چلاؤ۔''

اتنا کہہ کر میں رونے لگا اور وہ بھی آواز کے ساتھ—شاید میرے صبر اور ضبط کا بند ٹوٹ چکا تھا۔مجھے روتا دیکھ کر راجا اکرم مجھ سے لپٹ گیا اور جب وہ علیحدہ ہوا تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔''میں ابھی پتہ چلا لیتا ہوں۔میرے ساتھ چلو۔دفتر کھلوائے دیتا ہوں۔تم بیٹھ کر چاہئے پیو اور میں اس مہم پر روانہ ہوتا ہوں۔'' گریہ سے بھرّائی ہوئی آواز میں وہ بولا۔''میں چائے وائے نہیں پی سکوں گا۔بس تم گرنے والی کا پتہ چلاؤ،وہاں میری طرف سے یہ وعدہ کہ ہسپتال کی بدنامی کا باعث نہیں بنونگا۔'' میں راجا کے پیچھے چلا۔شعبہ تعمیرات کی چھوٹی سی خوبصورت عمارت میں اس کا دفتر تھا۔دفتر میں ابھی تک کام ہو رہا تھا۔دو چار آدمی ایک بڑا سا بلو پرنٹ دیکھ رہے تھے۔سپید گاؤن میں ملبوس ایک لمبا پتلی موچھوں والا گنجا آدمی کسی نقشے پر بات کر رہا تھا۔اس کے الفاظ میری سماعت تک پہنچ تو رہے تھے لیکن سنائی نہیں دے رہے تھے۔راجا اکرم نے اپنا کمرہ کھلوا لیا اور میں اس کمرے کے ایک صوفے میں دھنس گیا،جو ایک کونے میں رکھا تھا۔اس دوران اکرم باہر جا چکا تھا میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہ رہی تھیں۔آنسوؤں کی ہر چھوٹی بڑی میں 'وہ' تھی۔وہ جو میری نہ ہوتے ہوئے بھی میری تھی۔ارض و سما میں بلکہ شاید پوری کائنات میں صرف اور صرف وہی تو تھی جو حقیقی معنوں میں میری تھی۔چھت پر سے گرنے کے باوجود وہ زندہ سلامت تھی۔اسے کچھ نہیں ہوا تھا۔اسے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔'' میں نے اپنے آپ کو یقین دلایا۔مجھے یاد آیا اس نے مجھے لکھا تھا۔''جب تک میرا حافظہ نہ جاتا رہے میں تمہیں نہیں بھولونگی۔'' اس نے اپنے مرنے کا نہیں لکھا تھا تو پھر وہ کیسے مر سکتی تھی۔؟'' اسے مرنا

نہیں ہے۔مجھ سے پہلے تو ہرگز نہیں'' مجھے نہیں معلوم صوفے پر بیٹھے ہوئے روتے روتے بیہوش ہو گیا تھا یا اس کی یاد میں گم ہو گیا تھا۔ جب میں ہوش میں آیا راجا اکرم کا چپراسی مجھ سے مخاطب تھا۔''صاحب چائے حاضر ہے۔'' میں نے چپراسی کو دیکھا۔ وہ مجھے کسی اور دنیا سے آئی ہوئی مخلوق لگا۔ اصل بات یہ تھی کہ میں خود کسی اور دنیا میں پہنچا ہوا تھا اور چپراسی کی آواز نے مجھے اسکی دنیا میں لا ڈالا تھا۔''اللہ بخش۔تم نے چائے بیکار ہی بنائی۔ میں نے تمہارے صاحب کو پہلے ہی منع کر دیا تھا۔اب تم یوں کرو کہ چائے واش بیسن میں انڈیلو اور کپ دھوڈالو۔تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' میں نے چپراسی سے کہا۔'' آپ شکریہ کہہ کر شرمندہ نہ کریں صاحب جی۔ میں آپ کا نوکر ہوں جی۔ خادم ہوں۔'' چپراسی بولا لیکن اس نے چائے کا کپ رکھا رہنے دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا صاحب راجا اکرم کسی طرح چائے کا کپ دیکھ لے۔اسی لمحے راجا اکرم آپہنچا اور میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ وہ ناکام لوٹا تھا۔

''ان لوگوں نے تم کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ ظالم کمینے''

''یہی کہ چھت پر سے آج شام کوئی نہیں گری۔''

''اس کا مطلب ہسپتال کا ایڈمنسٹریٹر معاملے کو دبانے پر تلا ہوا ہے''

یہ کہہ کر میں اٹھا اور باہر جانے لگا۔ راجا اکرم میرے تیور دیکھ کر اٹھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔

''تم کہاں چلے۔؟''

''اس خبیث ایڈمنسٹریٹر سے نمٹوں گا۔''

''تم ہوش میں ہو۔؟ ہمارے پاس ایک گواہ بھی ایسا نہیں ہے جس نے اس کو چھت سے نیچے گرتے دیکھا ہو۔''

''میں ہوں نا۔ میں نے اسے چھت سے نیچے گرتے دیکھا تھا۔'' یہ کہہ کر میں کسی چھوٹے بچے کی مانند رو پڑا۔''میں نے گرتے دیکھا تھا۔ اپنی جان کو۔ اپنی روح کو۔''

''جب ایڈمنسٹریٹر آپ سے پوچھے گا کہ آپ کی وہ کیا لگتی تھی تو آپ اس کو یہی جواب دیں گے کہ وہ آپ کی جان تھی۔آپ کی روح تھی۔ آپ کہتے ہیں وہ چھت سے گری تھی تو اس کو ہسپتال میں ہونا تھا اور ہسپتال والے ایسے کسی کیس سے لاعلم ہیں۔اگر اس کے بارے میں آپ سے پوچھ گچھ کی جائے تو آپ اس کی اور اپنی شناخت درج کروائینگے۔؟ مجھے یقین ہے کہ آپ ایسا کچھ بھی نہیں کرینگے۔آپ اس کے لوگوں کا سامنا بھی نہیں کرینگے۔آپ پر یہ الزام بھی آسکتا ہے کہ خود آپ ہی نے اس کو چھت سے دھکا دیا یا کسی کو اس کام پر لگایا۔ بھائی۔ کچھ دیر بیٹھو اور اس پورے معاملے پر نظر ثانی کرو۔''

اس لمبی تقریر کے بعد وہ خاموش ہو گیا اور مجھ کو بھی خاموشی کے غار میں دھکیل دیا۔اس غار کے اطراف سوچوں کا جنگل تھا خاموشی کے غار میں خاموشی کے علاوہ وہ بھی تھی جو چھت سے نیچے گر پڑی تھی اور جس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس کو آسمان کھا گیا تھا یا زمین نگل گئی تھی۔سوچوں کے جنگل میں درندے میرے ذہن کی جانب منھ پھاڑے دھاڑ رہے تھے۔''تو اس کا کون ہے۔؟''

خاموشی کے غار کے باہر آتے ہی میں کھڑا ہو گیا۔ رات پڑے دیر ہو چکی تھی۔ میری خاطر میرا دوست راجا اکرم بھی اپنے دفتر میں رکا ہو

اٹھا اور چپراسی اللہ بخش کو بھی گھر جانے میں تاخیر ہو رہی تھی میرے ساتھ ہی راجا اکرم بھی کھڑا ہوا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا اس سے جو کچھ بن پڑا وہ کر چکا تھا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کو اپنے دکھ میں شریک کر لیا تھا۔ بغیر کچھ بولے اس نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبایا۔ میں نے اس کی آنکھوں سے اپنی آنکھیں نہیں ملائیں اور دبی زبان میں خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔

ہمیشہ کی طرح باہر کی دنیا معمول کی زندگی گزارنے پر مجبور کرنے پر تلی بیٹھی تھی۔ برسوں سے یہی ہوتا چلا آیا تھا۔ چھت سے گرنے والی مجھ سے الگ کسی اور دنیا میں زندگی گزار رہی تھی۔ وہ میری ہوتے ہوئے بھی کسی اور کی ہو گئی تھی۔ ادھر میں بھی اس کا ہوتے ہوئے بھی کسی اور کا ہو گیا تھا۔ ہم دونوں کی دنیاؤں کے درمیان بڑے فاصلے اور مذہب کی سنگین دیوار حائل تھی۔ ہسپتال سے باہر نکل کر میں نے اپنی گاڑی اپنے گھر کے بجائے ایک ہوٹل کی طرف موڑ دی۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ گاڑی نے مجھے ہوٹل کی طرف موڑ دیا۔ گھر میں اطلاع دے دی کہ رات میں نہ آسکونگا۔ مزید یہ بھی کہہ دیا کہ ممکن ہے مجھے دو تین روز کے لئے اسلام آباد جانا پڑے۔ رات ہوٹل میں گزاری۔ روم سروس وغیرہ منع کر دی اور سختی سے ہدایت کر دی کہ مجھے تنہا چھوڑ دیا جائے۔ ہوٹل کے کمرے میں بغیر معمولات شب اور بغیر کپڑے بدلے، بستر پر گر کر لحاف کے اندر چلا گیا۔ اگر میں اپنے حواس میں ہوتا تو اپنے پرائیویٹ آفس سے سفری ہینڈ کیری لے آتا جس میں ضرورت کی ہر چیز ہمہ وقت پیک رہتی تھی۔ جیسے ہی میں ہوٹل کے کمرے میں تنہا ہوا وہ میرے پاس آ گئی اور بولی۔

''یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔؟ اپنے آپ کو سنبھالو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں نا۔ ہمیشہ کی طرح—'' اور میں اس سے لپٹ کر دنیا و ما فیہا سے بے خبر ہو گیا۔

صبح جب میں بستر سے اٹھا تو یوں لگا جیسے وہ پہلے ہی بیدار ہو کر، شاور لے کر باہر چلی گئی ہو۔ جیسے وہ میرے ساتھ ہی رہتی ہو جیسے وہ ہوٹل کا کمرہ نہ ہو بلکہ ہمارا گھر ہو۔ لیکن حقیقت میں نہیں تھا۔ میں نے دانت برش کئے، شیو کئے بنا شاور لیا۔ روم سروس والا چائے، ناشتے کو پوچھنے کے لئے آیا میں نے منع کر دیا۔ ہوٹل کاؤنٹر پر بل ادا کر کے، روم سروس اور واش روم سروس کے بندوں کو مناسب ٹپ دیکر میں باہر نکل تو گیا لیکن گاڑی میں بیٹھنے تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے آگے کیا کرنا تھا۔؟ گھر جاؤں اور میڈیا سے یہ امید کروں کہ مجھے گھر بیٹھے خبر دے دیں۔ کم از کم اس کی گمشدگی کی خبر تو آئی ہی ہوگی یا ایک بار پھر ہسپتال جاؤں اور ادھر ادھر معلوم کروں لیکن گاڑی نے خود ہی یہ فیصلہ کر ڈالا کہ گھر کے راستے پر نہیں پڑی۔ اس کے بعد اسٹیرنگ نے گاڑی کو ہسپتال کے گیٹ کے اندر داخل کر دیا۔ گاڑی پارک کر کے میں انکوائری اور ایمرجنسی کاؤنٹر کے سامنے بے مقصد چکر لگانے لگا۔

وہاں رونق تھی۔ میں نے لوگوں پر بھی نظر ڈالی لیکن کسی پر بھی نظر نہیں رکی بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں شاید دیکھنے سے قاصر رہا اور جلد ہی وہاں سے نکل گیا۔ آئی سی یو وارڈس میں ایک دو نرسوں اور گارڈوں سے سر کھپا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اس کی شباہت رکھنے والی کوئی مریضہ آئی سی یو (I.C.U) میں تو نہیں داخل تھی۔ لیکن ناکام رہا۔ نیچے اتر کر میں نے وہ فیصلہ لیا جو میں لینا نہیں چاہتا تھا۔ ہسپتال کے قبرستان جانے کا فیصلہ۔ اس فیصلے نے ایک بار پھر میری دونوں آنکھوں کو رواں کر دیا۔ میرے اندر کا سب کچھ پانی ہونے لگا۔ میرے لئے بہتر طریقہ کار یہ تھا کہ ہسپتال کے تیسرے گیٹ سے اندر داخل ہوں اور بیرونی دیوار کے آخری سرے پر جھاڑیوں سے بنائی ہوئی ایک

باڑھ کے پیچھے پہنچ جاؤں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ لاوارثوں کے اس قبرستان میں داخل ہو کر میں نے چاروں اور نظر ڈالی۔ السلام علیک یا اھل القبور (تم پر سلامتی ہو اے قبر والو) میں نے اپنی دین کی شریعت پر عمل کرتے ہوئے ہلکی لیکن صاف آواز میں کہا۔ اس دوران ایک جوان آدمی، دو دس، بارہ سالہ لڑکوں کے ساتھ نہ جانے کہاں سے برآمد ہو گیا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور بولا آپ کا کوئی بندہ۔؟'' میں نے اس کو اور ان لڑکوں کو نہ دیکھتے ہوئے دیکھا اور اپنی بے سبب گریہ بھرّ رائی ہوئی آواز پر قابو پا کر پوچھا۔ ''کسی مائی کی قبر۔ کل رات یا آج فجر والی'' ''آپ کون۔؟'' اس نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔ مجھے اس کے اس سوال پر غصہ آ گیا۔ ''عجیب دنیا ہے۔'' میں نے سوچا ۔'' یہاں قبروں پر بھی رشتے داروں کا اجارا ہے۔'' اپنی مجبوری پر خود مجھے بھی ترس آنے لگا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے یہی سوال دہرایا۔'' آپ کی کون۔؟'' اور خود ہی جواب دیا۔ ''میری سب کچھ۔'' یہ جواب میں اس قبرستان کے مجاور کو نہیں دے سکتا تھا سو خاموش رہا۔

''کس کا کون۔؟'' میرے لاجواب ہو جانے کے فوراً بعد کسی نے میرے عقب سے سوال کیا۔ یہ وہی درویش تھا جس نے مجھے 'قبرستان' کا اشارہ دیا تھا۔ اس وقت جب میں ہسپتال میں چھت سے گرنے والی کے بارے میں پوچھتا پھر رہا تھا۔ میں نے پلٹ کر اس کو دیکھا۔ اس مرتبہ اس کے بال کُھل کر، دونوں شانوں اور پیٹھ پر لہرا رہے تھے۔ اور اس کے روشن چہرے کو اپنے احاطے میں لیکر روشن تر بنا رہے تھے۔ روشنی نے میری آنکھوں میں چکا چوندسی پیدا کر دی۔ میری نگاہیں آپ ہی آپ جھک گئیں۔ میں نے دیکھا یا محسوس کیا اس مجاور نما شخص نے اپنے دونوں ہاتھ، ادب سے پیٹ پر ناف کے قریب باندھ لئے تھے دونوں لڑکے بھی ادب کے انداز میں آ گئے تھے اگر چہ انہوں نے آنکھیں نہیں جھکائیں۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس درویش کو دیکھ رہے تھے۔ ''اسلام علیکم سائیں۔ یا علی مدد'' مجاور نما آدمی نے درویش کو سلام کیا۔ ''یا علی مدد۔ وقت شاہ بابا۔'' لڑکوں نے بلند آواز میں کہا۔

''کوئی کسی کا نہیں۔ سب وقت کے ہیں ــ وہ ــ وہ اپنا وقت بسر کر گئی ــ آگے اس جھاڑ کے نیچے ــ مٹی اوڑھے۔''

درویش کے الفاظ نے میرے پیروں کو متحرّک کر دیا اور میرا بدن اپنے آپ ہی ادھر بڑھا جدھر درویش نے اشارہ کیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھ سے قدرے فاصلہ رکھ کر وہ سب میرے پیچھے آ رہے تھے۔

اس نئی بنی ہوئی لحد پر پھول تھے۔ ''ہسپتال کی انتظامیہ کی ہدایات میں قبر پر پھول ڈالنا بھی شامل ہوگا۔'' میں نے سوچا۔ میرے اندر سے یقین کی ایک لہر اٹھی اور میرے ذہن کے صف اول میں پہنچ کر رُک گئی۔ میں اس نئی بنائی ہوئی، مٹی کی کچّی قبر کی پائنتی کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''تم ہی ہو۔ نا۔ تم نے مذہب کی بنیاد پر شادی کی درخواست (Proposal) ٹھکرا دی تھی۔ یاد ہے نا۔ میں نے تمہیں راضی کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ میں نے تم سے وعدہ بھی کیا تھا کہ تمہیں مذہب تبدیل کرنے کے لئے کبھی مجبور نہیں کروں گا لیکن تم نے ہر مرتبہ ہنسی میں ٹال دیا تھا۔ میں نے بچوں کو مذہب اختیار کرنے کی آزادی دینے کا بھی وعدہ کیا تھا لیکن تم نہیں مانیں اور ہنستی رہیں۔ دیکھو۔ اب تم میرے مذہب کے طریقے پر دفن ہوئی ہو۔ دیکھ رہی ہو۔''

''دیکھ رہی ہوں۔ لیکن میں مری ہوں اپنے مذہب پر اور اس سے بھی ہنس رہی ہوں۔'' وہ بولی۔ میں نے دیکھا وہ میرے سامنے کھڑی ہنس

رہی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میرے پیچھے آنے والوں کا کہیں بھی پتہ نہیں تھا۔ مجاور نما آدمی۔ اس کے دونوں لڑکے غائب ہو گئے تھے البتہ وقت شاہ فقیر کا پرچھاواں سا کھڑا تھا اور آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔

پیچھے بہت پیچھے ماورائی افق پر۔ وقت کی سُرنگ سے خلق برآمد ہوتی جا رہی تھی۔ وقت کی سُرنگ میں خلق داخل ہو کر نظروں سے غائب ہوتی جا رہی تھی۔ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری تھا۔ برآمد ہونے کا اور غائب ہونے کا۔ وہ ہنسے جا رہی تھی اور اس کا انگ انگ، رُواں رُواں ہنس رہا تھا۔ یہ اس کے ہنسنے کا انداز تھا۔

میں اس کے ساتھ قدم بہ قدم چل رہا تھا۔ سُرنگ کے داخلی راستے کی جانب۔ آہستہ آہستہ۔ آہستہ آہستہ۔!!